

# شہرِ زمانہ

آؤ

ہدیہِ الٰہی

ہمارے سوسائٹی فاؤنڈیشن کا

## شہر ذات

”خدا کا خوف کرو فلک! اتنی دیر میں لوگ چاند پر جا کر واپس آ جاتے ہیں جتنی دیر میں تم صرف اپنی آنکھوں کا میک اپ کر رہی ہو۔ میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتی ہوں، وہاں مسلمان انصر کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لیے اتنے ہتھیاروں سے لیس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

رشنا کی بیزاری اب اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور وہ سیدھا سیدھا طنز کرنے پر اتر آئی تھی۔ مگر اس کی کسی بات کا فلک پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی سکون و اطمینان سے اپنی پلکوں پر مسکارا کی ایک اور کوئنگ کرتی رہی۔

”اٹھ جاؤ فلک! اٹھ جاؤ ہم کنسرٹ پر جا رہے ہیں کسی فیشن شو میں نہیں اب بس کرو۔“ اس کی خاموشی نے رشنا کو کچھ اور تپایا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر اس کے سامنے پڑی میک اپ کٹ کو اٹھا کر بند کر دیا۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے یا! چند منٹ انتظار نہیں کر سکتیں؟“ فلک نے اس کے ہاتھ سے میک اپ کٹ چھینتے ہوئے کہا۔

”مجھے قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہے مگر یا ر جتنی جانفشانی سے تم میک اپ میں مصروف ہو، اس سے تمہیں ضرور کوئی تکلیف ہو جائے گی۔“

فلک اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ایک بار پھر مسکارا لگانے میں مصروف ہو گئی۔ رشنا ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ کر ہلکی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگی فلک اپنے چہرے پر جچی اس کی آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میک اپ میں مصروف رہی۔

”فلک! تمہیں آخر میک اپ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمہیں تو خدا نے پہلے ہی بہت مکمل بنایا ہے۔ میک اپ کی ضرورت تو ان لوگوں کو ہوتی ہے جن میں کوئی خامی کوئی کمی رہ گئی ہو۔ تم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ چند لمحے اس کے چہرے پر نظر جمائے رکھنے کے بعد رشنا نے کہا۔

ایک دلکش مسکراہٹ فلک کے چہرے پر لہرائی۔ ایک خاص ادا سے دایاں ابرو اچکا کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”جانتی ہوں مجھے میک اپ کی ضرورت نہیں ہے مگر مسلمان کو میک اپ پسند ہے اور جو چیز اسے پسند ہے، وہ فلک کو کیسے ناپسند ہو سکتی ہے۔ مس رشنا کمال! یہ سب سنگھار صرف اسی ایک شخص کے لیے کر رہی ہوں تاکہ اس کی نظر کہیں اور نہ جاسکے۔ اگر کوئی چہرہ اس کے خیالوں میں رہے تو وہ بھی چہرہ ہوا اگر کوئی وجود اس کی نظر کو اسیر کرے تو وہ بھی وجود ہو۔“

فلک نے میک اپ کٹ بند کر کے دروازے میں رکھ دی۔

”دل تو اس بندے کا پہلے ہی جیت چکی ہو اب باقی کیا رہا جسے حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ وہ بندہ تمہارے پیچھے اس قدر دیوانہ ہے کہ اس سب سنگھار کے بغیر بھی اس کی نظر تمہارے علاوہ کسی اور چہرے پر نہیں ٹکے گی۔“

رشنا نے رشک آمیز حسرت سے کہا تھا۔ ایک تافخر آمیز مسکراہٹ سے فلک اپنے تراشیدہ بالوں میں برش کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔



خوبصورتی کی اگر کوئی حد ہوتی تو وہ حد فلک شیر آگن تھی۔ وہ مجسم حسن تھی جو نظر ایک بار اس چہرے کو دیکھ لیتی وہ دوبارہ کچھ اور دیکھنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔ اسے نظروں کا اسیر کرنے کا ہنر آتا تھا۔ بعض دفعہ وہ اپنے وجود کو آئینے میں دیکھتی اور خود اپنے سحر میں گرفتار ہو جاتی اور پھر سوچتی۔ ”اگر میں ایک عورت ہوتے ہوئے خود اپنے ہی عکس سے نظر ہٹا نہیں سکتی تو کسی مرد کے لیے یہ کتنا مشکل ہوگا۔“

یہ احساس اسے بیٹھے بٹھائے قلو پطرہ بنا جاتا پھر وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی سنگھار میں مصروف رہتی۔ بہت سے لوگوں کو دنیا میں صرف ایک چیز ملتی ہے اور بس ایک ہی چیز ملتی ہے۔ بعض لوگوں کو دنیا میں سب کچھ ملتا ہے اور سب کچھ ہی ملتا ہے، فلک شیر آگن دوسری فہرست میں آتی تھی۔ وہ شیر آگن جلیل کی اکلوتی بیٹی تھی اور شیر آگن جلیل ملک کے نامور انڈسٹریسٹ تھے۔ اسے چاہا نہیں گیا تھا۔ بے تحاشا چاہا گیا تھا اگر اس کے ماں باپ کا بس چلتا تو وہ واقعی اسے اپنی پکوں پر بٹھا لیتے۔ وہ خود پسند بھی تھی اور خود پرست بھی مگر کوئی اور خای اس میں نہیں تھی یا شاید اس کا حسن کسی دوسرے کو اتنی جرات ہی نہیں دیتا تھا کہ وہ فلک شیر آگن کی کوئی خامی ڈھونڈ پاتا۔

اس نے ہر جگہ سے ستائش پائی تھی چاہے وہ گھر ہو یا سکول، کالج ہو یا یونیورسٹی۔ وہ لڑکیاں بھی جو اس سے حسد کرتی تھیں۔ کہیں نہ کہیں ان کے دل میں بھی اس سے دوستی کی خواہش ضرور رہتی تھی۔ بعض دفعہ کوئی دل ہی دل میں اس سے سخت بدگمان ہوتا اسے ناپسند کرتا اس کے بارے میں دوسروں سے غلط باتیں کہتا اور پھر وہ ایک بار ہی اس سے مخاطب ہوتی، حال احوال پوچھتی، مسکراتی اور اگلا چاروں شانے چیت ہو جاتا پھر اس میں کوئی مزاحمت ہی باقی نہیں رہتی تھی۔ اگلے کتنے دن وہ اسی احساس کے ساتھ ساتویں آسمان پر رہتا کہ فلک شیر آگن نے اس سے بات کی ہے اس کا حال احوال دریافت کیا ہے اسے دیکھ کر مسکراتی ہے۔ پھر وہ دوبارہ کبھی اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ کر پاتا۔ وہ اکثر اپنے مخالفین کو اسی طرح چیت کیا کرتی تھی۔

وہ یونیورسٹی میں ایم ایف اے کر رہی تھی مگر اس کا حلقہ احباب لمبا چوڑا نہیں تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد محدود تھی۔ اس کی چند دوستیں وہی تھیں جن کے ساتھ اسکول کے زمانے سے اس کی دوستی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلق نہ صرف مضبوط ہوا تھا بلکہ اس کی دوستوں میں کوئی اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔ رشنا بھی اس کی ان ہی گہری دوستوں میں سے ایک تھی اور اس سے اور مریم سے ہی اس کا سب سے زیادہ میل جول تھا۔ فلک کے لیے رشتے تب سے آنے شروع ہو گئے تھے جب وہ اسکول میں تھی۔ مگر شیر آگن نے بڑی خوبصورتی سے سب کو نال دیا تھا وہ چھوٹی عمر میں اس کی شادی کرنا نہیں چاہتے تھے ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ فلک کے لیے کبھی بھی رشتوں کی کمی نہیں ہوگی۔ وہ نہ صرف بے پناہ خوبصورت تھی بلکہ ان کی ساری دولت کی بھی مالک تھی پھر ایسی سونے کی چڑیا کو پھانسنے کے لیے شکاریوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ کیوں نہ ہوتا۔

وہ شروع سے کوا بکوشن میں پڑھی تھی اور شروع سے ہی اس کے پیچھے بھاگنے والوں کی فہرست بہت لمبی تھی۔ مگر فلک نے کبھی کسی کی پرواہ نہیں کی تھی یا پھر شاید اس کو کسی میں اتنی کشش ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کے بارے میں سوچتی بلکہ وہ اکثر اپنی فریڈز کے ساتھ مل کر ایسے عشاق کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ رشنا اکثر اس سے کہا کرتی تھی۔ ”جو لوگ خود خوبصورت ہوتے ہیں، انہیں کسی دوسرے سے محبت ذرا کم ہی ہوتی ہے اور عشق تو دور کی بات ہے۔“ وہ ہر بار اس کی باتوں پر قہقہہ لگایا کرتی تھی۔

سلمان انصر سے اس کی ملاقات اپنی ایک دوست کی بہن کی شادی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ آداری میں سوئمنگ پول کے کنارے ایک

ٹیل پر وہ اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی حسب معمول بہت سی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی اور اس بات سے آگاہ بھی تھی اور بے پرواہ بھی اپنی دوستوں کے کسی بات پر قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی نظر سوئمنگ پول کے دوسرے کنارے پر موجود ایک ٹیل پر پڑی تھی۔ سیاہ جینز اور اسی رنگ کی لیدر کی جیکٹ اور ٹی شرٹ میں ملبوس وہ بندہ اس ٹیل کی سب سے خاص چیز تھا۔ وہ اتنی دور سے بھی اس کے چہرے کے نقوش کی خوبصورتی کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے کی بات سن رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس سے کوک کے سب لے رہا تھا۔ فلک چاہتے ہوئے بھی اس سے نظر ہٹانے نہیں پائی۔ اپنی فریڈ کے ساتھ ہاتھ کرتے ہوئے وہ وقفے وقفے سے اسے دیکھ رہی تھی اور کچھ دیر بعد چانک اسے احساس ہوا تھا کہ وہ صرف فلک کی توجہ کا مرکز نہیں تھا۔ کچھ اور نظریں بھی بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اور اس احساس نے پہلی بار اسے حسد سے روشناس کروایا تھا۔ اس کے دل میں بڑی شدت سے اس کے پاس جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔

”رشنا! یہ سوئمنگ پول کے دوسری طرف ٹیل پر بلیک آؤٹ فٹ میں جو بندہ ہے، اسے جانتی ہو؟“

اس نے اچانک رشنا سے سرگوشی میں پوچھا جو اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی رشنا نے نظر دوڑائی تھی۔ ”نہیں یا یہ کوئی نیا بندہ ہے کم از کم میں واقف نہیں ہوں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

پھر فلک نے یہی سوال ٹیل کے گرد بیٹھی ہوئی اپنی دوسری دوستوں سے کیا تھا۔ سب کا جواب نفی میں تھا۔

”رمضہ سے پوچھو، میرا خیال ہے، یہ اس کے بہنوئی کا کوئی دوست ہوگا۔“ رشنا نے اس سے کہا تھا۔ وہ رشنا کے ساتھ اٹھ کر اسٹیج کی طرف آ گئی تھی۔ وہاں رمضہ، دو لہا دلہن کے ساتھ بیٹھی تصویریں بنوا رہی تھی۔ فلک نے اسے ایک طرف بلوایا اور اس بندے کے بارے میں پوچھا تھا وہ اپنے بھائی سے اس کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔

”یہ سلمان انصر ہے، اسد بھائی کا کزن ہے۔“ اس نے آکر اپنے بہنوئی کا نام لیا تھا۔ فلک نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے ملوائے۔ ”اچھا چلو ٹھیک ہے۔ اسد بھائی کا چھوٹا بھائی جمشید بھی اسی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس کے پاس تمہیں لے جاتی ہوں ظاہر ہے وہ خود ہی ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کا تعارف کروادے گا۔“ رمضہ نے اس ٹیل پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

فلک دھڑکتے دل کے ساتھ رمضہ کے ساتھ اس ٹیل کی طرف آ گئی تھی۔ وہ دور سے جتنا خوبصورت نظر آ رہا تھا پاس آ کر اس سے زیادہ اچھا لگا تھا اسے۔ رمضہ کے ساتھ جب وہ اس ٹیل کے پاس پہنچی تو رمضہ نے جمشید سے اس کا تعارف کروایا تھا پھر جمشید نے باری باری ٹیل کے گرد بیٹھے ہوئے لڑکوں کا تعارف ان سے کروایا تھا۔

سلمان انصر نے اپنے تعارف پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پہلو کہا تھا۔ پھر وہ پہلے کی طرح ارد گرد نظر دوڑانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ فلک کے لیے یہ بات حیران کن تھی۔ وہ اس ٹیل پر بیٹھے ہوئے دوسرے لڑکوں کی طرح اسے ستائشی نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ٹھیس لگی تھی، کچھ دل گرفتہ سی وہ واپس اپنی میز پر آ گئی تھی۔ فلکشن کے اختتام تک اس کی توجہ اسی پر مرکوز رہی تھی مگر اس نے سلمان انصر کو ایک بار بھی اپنی طرف متوجہ نہیں دیکھا۔



اگلے کئی دن وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ چہرہ جیسے اس کے دماغ میں کہیں فیڈ ہو گیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پارتی تھی۔

سلمان انصر سے اس کی دوسری ملاقات Pace میں ہوئی تھی۔ وہ ہاتھوں میں کچھ شاپنگ بیگز تھا۔ باہر کی طرف آ رہا تھا۔ جبکہ وہ اندر جا رہی تھی۔ اسے سامنے سے آتے دیکھ کر فلک کے قدم رک گئے۔

”ہیلو!“ پاس آنے پر فلک نے بے تابی سے اسے مخاطب کیا وہ کچھ حیران ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نہیں تھی۔

فلک کو شاک لگا۔ ”کیا مجھ میں ایسی کوئی بات بھی اسے نظر نہیں آئی کہ یہ مجھے یاد رکھتا۔“ اس نے سوچا تھا۔

”سواری، میں نے آپ کو پہچانا نہیں ہے۔“

فلک نے کچھ دل گرفتہ ہو کر دو ہفتے پہلے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا۔

وہ ایک دم مسکرایا۔ ”مجھے یاد آ گیا کسی ہیں آپ؟“

اس کی مسکراہٹ نے فلک کی ساری سنجیدگی دور کر دی تھی ”میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟“

”فائن۔“

”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا میں آپ کو لُنج کی آفر کر سکتی ہوں؟“ اس نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر اس سے کہا تھا۔

وہ اس اچانک آفر پر کچھ حیران ہوا تھا۔

”لُنج آل رائٹ چلیں۔“ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

دونوں باہر نکل آئے۔ فلک نے اپنے ڈرائیور کو واپس بھجوا دیا۔ سلمان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اسکا دل بہت تیزی سے دھڑک

رہا تھا۔

”کہاں چلیں؟“ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”فیوجی یا ما۔“ وہ گاڑی کو یورس کرتے ہوئے سڑک پر لے آیا تھا۔

”آپ پڑھتی ہیں؟“ اس نے اپنی فی شرٹ کے ساتھ لٹکتے ہوئے سن گلاسز اتار کر لگاتے ہوئے کہا تھا۔

فلک نے اسے اپنے بارے میں بتایا۔

”اور آپ؟“

”مجھے تو کافی سال ہو گئے اپنی تعلیم مکمل کئے۔ اکناکس میں ماسٹرز کیا ہے۔ سرائکس کی فیکٹری ہے میرے ڈیڈی کی وہیں ہوتا ہوں۔“ وہ آہستہ

آہستہ اپنے بارے میں بتاتا گیا۔ پھر گفتگو کا سلسلہ طویل ہوتا گیا تھا۔

(فیوجی یا ما) میں ہونے والا یہ لُنج پہلا اور آخری لُنج ثابت نہیں ہوا تھا۔ ان کی ملاقاتوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی اور پھر اینڈ رزلٹ وہی ہوا تھا

جو فلک نے چاہا تھا۔ سلمان نے اسے پروپوز کر دیا اور اس نے ایک لمحہ کے تامل کے بغیر یہ پروپوزل قبول کر لیا۔ سلمان اسے پہلی ملاقات میں ہی دوسرے مردوں سے مختلف لگا تھا۔ فلک بیس سال کی تھی اور وہ اس سے دس سال بڑا تھا فلک کی طرح وہ نہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک اٹھتا تھا اور نہ ہی کسی بات پر فوراً اپنا رد عمل ظاہر کرتا تھا۔ وہ بہت سوبر اور ڈیسینٹ تھا۔ پرسکون انداز میں ٹھہر ٹھہر کر دھیمی آواز میں بات کیا کرتا تھا اور فلک کسی سحر زدہ معمول کی طرح اسے بات کرتے دیکھتی رہتی تھی۔ وہ کبھی بھی کسی کی بات اتنے انہماک سے نہیں سنتی تھی جس طرح وہ سلمان کو سنتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ سلمان کے پروپوز کرنے پر جیسے اس کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی اسے پہلی بار اپنی خوش قسمتی پر یقین آیا تھا لیکن ابھی کچھ شکاات باقی تھیں۔

گھر میں اس پروپوزل کا ذکر کرنے پر جیسے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ شیر آنگن کو اعتراض تھا کہ وہ اُن کی برادری کا نہیں ہے اور ویسے بھی وہ فلک سے دس سال بڑا تھا۔ ایک اور اعتراض انہیں یہ تھا کہ وہ بلاشبہ ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ فیملی شیر آنگن جلیل کی لگر کی نہیں تھی فلک کے لیے اگر یہ ساری باتیں بے معنی تھیں تو شیر آنگن کے لیے یہی چیزیں اہمیت رکھتی تھیں۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے داماد بھی ویسا ہی چاہتے تھے اور سلمان اس معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ مگر فلک کی ضد کے آگے ان کی مخالفت زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ وہ اس کے رونے دھونے اور خاموشی کو برداشت نہیں کر سکے تھے اور انہوں نے سلمان کے رشتہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کر لیا تھا۔

مگر شیر آنگن کی ناپسندیدگی سلمان سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ منگنی کے فوراً بعد ان کے اختلافات ایک بار پھر ابھر کر سامنے آئے تھے جب شیر آنگن نے یہ کوشش کی تھی کہ سلمان اپنی فیکٹری چھوڑ کر ان کے بزنس کو دیکھنا شروع کرے۔ انہوں نے یہ پیش کش فلک کے ذریعے کی تھی۔

”یعنی تمہارے فادر کو ایک ایسا داماد چاہئے جو ان کی فاکلوں والا بریف کیس اٹھا کر ان کے پیچھے پیچھے چلے، سرونٹ کم سن ان لاء۔“ اس کا لہجہ طنز یہ تھا فلک کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو سلمان؟ کیا میرے پاپا تمہیں نوکر بنا کر رکھیں گے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم ان کا بزنس سنبھالنا شروع کر دو ظاہر ہے ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے اور میری شادی جس سے بھی ہوتی، اسے پاپا کا بزنس تو سنبھالنا ہی ہوتا۔“ اس نے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

”اور میری سراسر اکس کی فیکٹری کا کیا ہوگا؟“ اس نے کچھ دیر بعد فلک سے پوچھا تھا۔

”تم اپنے کسی بھائی کے سپرد کر سکتے ہو یا اپنی جگہ کوئی جنرل منیجر رکھ سکتے ہو۔“ فلک نے مشورہ دیا تھا۔ وہ کافی کے سپ لیتے ہوئے کچھ دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ”کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں، میں نے تم سے بات ہی نہیں کی اور یہی غلطی کی ہے، میرا خیال ہے انگریجمنٹ سے پہلے ہی مجھے تم سے ان چیزوں کے بارے میں بات کر لینی چاہئے تھی۔“ اس کا لہجہ خاصا سرد تھا۔

فلک کچھ چونک گئی تھی۔

”مجھے شادی ایک لڑکی سے کرنی ہے۔ کوئی باس گھر لے کر نہیں آتا ہے۔ میرا خیال ہے میں اس طرح کا شوہر ثابت نہیں ہو سکتا جس طرح کا تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو ضرورت ہے۔ اگر میرا اپنا بزنس نہ ہوتا تو میں تمہارے فادر کے بزنس کے بارے میں سوچتا لیکن اب میری اپنی



فیکٹری ہے جو پوری طرح سے اسٹیکلش ہے۔ تم چاہتی ہو، میں وہ چھوڑ کر تمہارے فادر کے بزنس کو جوائن کر لوں جو میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی کو اپنے طریقے سے گزارنا چاہتا ہوں۔ بیوی یا ان لازمی مرضی کے مطابق نہیں۔ میرا خیال تھا ہم نے کافی وقت اکٹھا گزارا ہے تم مجھے کسی نہ کسی حد تک سمجھ چکی ہوگی مگر میرا خیال غلط ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے ہمیں کسی نئے رشتے میں بندھنا نہیں چاہئے۔“

اس نے اپنی بات کے اختتام پر اپنی انگلی سے مگنکی کی انگلی اتار کر فلک کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ اس نے والٹ نکال کر بل کے پیسے مینوکا رڈ میں رکھے اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ فلک کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی چھوٹی سی بات پر یہ قدم..... اس نے اسے ریسٹورنٹ کے دروازے سے نکلتے دیکھا تھا اور پھر جیسے وہ اپنے حواس میں واپس آ گئی تھی۔ اپنا بیگ اور انگلی اٹھا کر وہ بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے گئی تھی۔ وہ پارکنگ کی طرف جا رہا تھا۔

”آئی ایم سوری سلمان! اگر تم میری بات پر ہرٹ ہوئے ہو تو..... لیکن میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ اس نے پاس آ کر اس کے کندھے کو تھام کر لجاجت سے کہا تھا۔

وہ رک گیا تھا۔ ”بات ہرٹ ہونے یا نہ ہونے کی نہیں ہے بات اپنی اپنی خواہش اور ضرورت کی ہے۔ تمہارے فادر کو واقعی ایک شخص کی ضرورت ہے جو ان کے بزنس کو سنبھالے مگر میں.....“

اس نے بڑی نرمی سے اس سے کہا تھا مگر فلک نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اس موضوع پر ہمارے درمیان دوبارہ کبھی بات نہیں ہوگی۔ جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔ پاپا کیا سوچتے ہیں یا کیا چاہتے ہیں۔ میں تم سے دوبارہ کبھی اس بات کا ذکر نہیں کروں گی۔“ اس نے قطعی لہجے میں سلمان سے کہا تھا ”اور اب تم یہ انگلی پیمن لو۔“ سلمان نے کچھ سوچتے ہوئے رنگ پکڑ لی۔

شیراز گلن کی ناراضگی سلمان کے اس انکار کے بعد کچھ اور بڑھ گئی تھی انہوں نے فلک کو سلمان کے خلاف اکسانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اب ان کی کوئی بات سننے پر تیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سلمان اگر ان کا بزنس جوائن نہیں کرنا چاہتا ہے تو انہیں اس پر اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے بھی وہ سلمان کی اس حرکت کے بعد خوفزدہ ہو گئی تھی بہت دنوں تک وہ اس واقعہ کو ذہن سے نہیں نکال سکی تھی۔

”کیا سلمان کے نزدیک میری ذرا بھی اہمیت نہیں تھی کہ اس نے اتنی معمولی سی بات پر انگلی اتار کر پھینک دی؟“

یہ سوال بار بار اس کو خوفزدہ کر دیتا تھا۔

”مگر..... اگر اس کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہ ہوتی تو وہ مجھے شادی کا پرپوزل کیوں دیتا۔“ وہ جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کرتی تھی۔ ”ایک شخص سے محبت، انسان کو کتنا مجبور کر دیتی ہے میں نے زندگی میں کسی کی پراہ ہی نہیں کی اور اب اس شخص کی پراہ کی ہے تو مجھے احساس ہوا ہے کہ محبت کرنے کے بعد بندے کو کتنا جھکنا پڑتا ہے صرف اس خوف سے کہ کہیں دوسرا آپ کو چھوڑ نہ دے۔“

وہ سوچتی تھی۔ ہر بار یہ سوچ اسے دل گرفتہ کر دیتی تھی اور ہر بار سلمان کے سامنے آنے پر اس کی ساری دل گرفتگی جیسے دھواں بن کر غائب

ہو جاتی تھی۔ اس کے سارے شکوے جیسے ختم ہو جاتے تھے۔ وہ عام مردوں کی طرح لمبی چوڑی باتیں کرتا تھا نہ ہی اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا مگر فلک کو اس کی موسم کے حالات کے بارے میں کہی جانے والی بات بھی کسی خوبصورت اور رو میٹک شعر سے زیادہ اچھی لگتی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ مسلمان کو اس کے ساتھ بیٹھنا باتیں کرنا اس کے ساتھ چلنا پھرنا کیسا لگتا تھا۔ مگر اسے مسلمان کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے وجود پر فخر ہوتا تھا یوں جیسے وہ مسلمان کو نہیں پورے جہان کو اپنے ساتھ لیے پھر رہی ہو۔ جیسے دنیا میں اس کے علاوہ ہر لڑکی خالی ہاتھ ہو۔

اس کی زندگی میں اگر مسلمان پہلا مرد تھا تو مسلمان کی زندگی میں آنے والی بھی وہ پہلی لڑکی ہی تھی۔ وہ شروع سے ہی بہت ریزر و طبیعت کا ملک تھا اور لڑکیوں کے ساتھ گھومنا پھرنا کبھی بھی اس کی عادت میں شامل نہیں رہا تھا۔ فلک کی طرح وہ بھی اپنی خوبصورتی اور صنف مخالف کے لیے اپنی کشش سے واقف تھا اور اس کی طرح وہ خود پرست بھی تھا اور ان پرست بھی لیکن ان دونوں باتوں کے باوجود بھی فلک کی محبت میں گرفتار تھا۔ ہاں یہ محبت فلک کی طرح طوفانی اور سب کچھ قربان کر دینے والی نہیں تھی۔

ان کی منگنی تقریباً تین سال رہی تھی اور ان تین سالوں میں فلک نے خود کو مسلمان کی پسند کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ وہ مسلمان کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتی تھی جو رنگ مسلمان کو پسند تھے اس نے بھی وہی پہننا شروع کر دیئے تھے۔ جو رنگ مسلمان کو ناپسند تھے وہ جیسے اسکی زندگی سے بھی نکل گئے تھے۔ جو چیز مسلمان کو کھانے میں پسند تھی۔ لاشعوری طور پر وہ اس کی پسند بھی بن گئی تھی اور جس چیز سے مسلمان بھاگتا تھا۔ وہ بھی اسے اتنا ہی ناپسند کرنے لگی تھی اور یہ سب کچھ مسلمان کے کہے بغیر ہوا تھا۔ مسلمان نے کبھی اسے کسی بات پر مجبور نہیں کیا تھا مگر وہ خود ہی اسے خوش رکھنا چاہتی تھی۔ سرنا پاپاس کی پسند میں ڈھل جانا چاہتی تھی اس کی دوستیں اس میں آنے والی تبدیلیوں پر حیران تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فلک شیر انگن جو پتا نہیں خود کتنے دلوں کی دھڑکن ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف ایک شخص کے لیے اتنا بدل دے گی۔ اس کی ہر بات میں مسلمان انصر کا ذکر آتا تھا۔ بعض دفعہ اس کی دوستیں اس بات پر اس کا مذاق اڑاتیں مگر فلک کو کوئی پروا نہیں تھی۔

تین سال بعد بڑی دھوم دھام سے اس کی اور مسلمان کی شادی ہو گئی تھی۔ شادی سے کچھ عرصہ پہلے ہی مسلمان نے اپنے لیے ایک علیحدہ گھر لے لیا تھا اور فلک شادی کے بعد اسی گھر میں گئی تھی۔ شادی کے بعد فلک کے دل میں مسلمان کے بارے میں جو تھوڑے بہت خدشات تھے وہ بھی ختم ہو گئے تھے، وہ ایک بہت ہی محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ شادی سے پہلے کی جس بے نیازی اور بے پروائی نے فلک کو خوفزدہ کیا تھا۔ وہ شادی کے بعد غائب ہو گئی تھی۔ وہ فلک کا کسی ننھے بچے کی طرح خیال رکھتا تھا۔ شادی سے پہلے کی اس کی کم گوئی بھی ختم ہو گئی تھی۔

فلک کو اپنی زندگی پر پہلی بار رشک آنے لگا تھا۔ ٹھیک ہے میں نے اس شخص کے لیے اپنے آپ کو بہت بدلا ہے اسے خوش کرنے اور خوش رکھنے کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے مگر وہ سب بے کار تو نہیں گیا۔ مسلمان انصر کو احساس ہے کہ میں نے اس کے لیے کیا کیا ہے اور اس کے نزدیک میری ہر قربانی ہر ایثار کی اہمیت ہے۔“

وہ اکثر سوچتی اور مسرور ہوتی رہتی۔ شادی کے بعد مسلمان انصر کے شیر انگن کے ساتھ بھی تعلقات اچھے ہو گئے تھے حالانکہ فلک کو خدشہ تھا کہ شاید مسلمان کی انان تعلقات کی بہتری میں رکاوٹ بنے گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر فلک کے ساتھ اس کے گھر جایا کرتا تھا اور میمونہ اور شیر انگن



دونوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ خود شیر آنگن بھی اس کے بارے میں اپنے پچھلے خیالات اور رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ فلک کو اس کے ساتھ اس قدر خوش دیکھ کر اور مسلمان کے طور طریقے دیکھ کر وہ اسے پسند کرنے لگے تھے۔

مسلمان بہت لبرل قسم کا آدمی تھا اور کچھ یہی حال فلک کا تھا۔ شیر آنگن اور میمونہ نے جس ماحول میں فلک کی تربیت کی تھی وہاں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ بچپن میں ایک بار قرآن پاک پڑھ لینے کے بعد فلک نے دوبارہ اس مقدس کتاب کو ہاتھ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نماز اور روزے سے بھی وہ اپنی ماں کی طرح بے نیاز تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آج کے دور میں اتنا مذہبی ہونا خاصا دقتیاب کا کام ہے۔ جب کبھی دوستوں سے اس کی اس موضوع پر بات ہوتی تو وہ کہتی۔

”دیکھو یار! مجھے قیامت وغیرہ پر زیادہ یقین نہیں ہے جو کچھ ہونا ہے دنیا میں ہی ہوگا۔ اچھی یا بری جیسی زندگی بھی گزارنی ہے بس ایک بار ہی گزارنی ہے ایسا بار بار نہیں ہوگا۔

رشا کو بعض دفعہ اس کی باتوں پر اعتراض ہوتا کیونکہ وہ باقاعدگی سے نہ کسی لیکن نماز وغیرہ پڑھ لیا کرتی تھی۔ فلک اس کے اعتراض پر ہر دفعہ مسکرا کر کہتی۔

”دیکھو رشاشاہ! یہ عبادت وغیرہ بندہ تب کرتا ہے جب اس کی اللہ سے لمبی چوڑی فرمائشیں ہوں یا پھر اس نے اچھے خاصے گناہ کئے ہوں۔ میرے ساتھ تو دونوں مسئلے نہیں ہیں نہ تو میں اللہ سے کچھ مانگتی ہوں اور نہ ہی میں کوئی گناہ کرتی ہوں پھر ہر وقت مصلے پر بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ۔“

رشا ہر بار خاموش ہو جاتی تھی۔ وہ اسے دلیل سے قائل نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ خود اس کا مذہب کے بارے میں علم بہت کم تھا اور وہ فلک کو دلیل کیسے دے سکتی تھی۔ فلک کے برعکس مسلمان اس طرح کی باتیں تو نہیں کرتا تھا۔ لیکن نماز، روزے سے وہ بھی کوسوں دور تھا۔ اس کے نزدیک اتنا ہی اسلام کافی تھا کہ بندہ مسلمان ہو اور اس کا نام بھی مسلمانوں والا ہو۔ ہاں زندگی کو ویسے گزارنا چاہئے جیسا زمانہ ہو۔

اس سے پھر وہ دونوں راوی کی سیر کے لیے گئے تھے۔ شادی سے پہلے بھی وہ دونوں اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ فلک کو یہاں دریا کے کنارے پر تہائی اور خاموشی میں آکر بیٹھنا بہت پسند تھا۔ بعض دفعہ جب مسلمان اس کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ اپنی کسی دوست کو ساتھ لے آتی۔ کشتی کے ذریعے وہ کامران کی بارہ درمی میں چلے گئے۔ دریا کے وسط میں بنی ہوئی یہ مغلیہ دور کی عمارت اسے بڑی اٹریکٹ کیا کرتی تھی۔ مسلمان اور وہ بارہ درمی کے مختلف حصوں میں پھرتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر جب شام ڈھلنے لگی تو وہ دونوں ایک بار پھر کشتی کے ذریعے بارہ درمی سے واپس کنارے پر آ گئے تھے۔

کنارے سے اوپر سڑک پر جانے کے لیے انہوں نے چلنا شروع کیا تھا جب فلک نے پچھلے کپڑوں اور لمبے بالوں اور داڑھی والے ایک فقیر کو دیکھا تھا۔ وہ دریا کے کنارے سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی اور بالوں میں کچھ لگا ہوا تھا اور پچھلے کپڑوں میں سے اس کا سیاہ سوکھا ہوا جسم نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن میں کچھ پتھر اکٹھے کئے ہوئے تھے اور وہ وقفہ وقفہ سے گڑھے میں پتھر پھینک رہا تھا۔ پتھر گرنے پر کچھ اور پانی اچھل کر ادھر ادھر گر رہا تھا۔ ان دونوں کو فقیر کے سامنے گزر کر جانا تھا اور فلک کا خیال تھا کہ ان کے گزرتے وقت فقیر پانی والے گڑھے میں پتھر نہیں پھینکے گا یہی اطمینان لیے وہ باتیں کرتی ہوئی مسلمان کے ساتھ اس گڑھے کے پاس سے گزرنے لگی اور اسی وقت فقیر نے اپنی گود میں رکھا ہوا

سب سے بڑا پتھر اٹھا کر گڑھے میں پھینکا تھا۔ ایک چھپا کے ساتھ گدلا پانی اڑ کر فلک کے چہرے اور لباس کو داغدار کر گیا تھا۔ سلمان دوسری جانب تھا اس کے کپڑوں پر بھی چھینے پڑے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی مگر فلک کے سفید لباس پر وہ کچھ بہت نمایاں ہو گیا تھا۔

”یو ایٹھ انڈے! اندھے ہوتے نظر نہیں آتا تمہیں کہ کوئی گزر رہا ہے۔“ وہ غصے کے عالم میں چلائی تھی۔

”میں واقعی اندھا ہوں۔ مجھے دنیا نظر نہیں آتی۔“

وہ اسکی بات پر ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ اپنے صلیب کے برعکس اس فقیر کی آنکھوں اور آواز میں بہت سکون، بہت ٹھہراؤ تھا۔ اس کا لب ولہجہ بہت شائستہ تھا۔ وہ ان پڑھ نہیں لگتا تھا۔

”اگر اندھے ہو تو یہاں بیٹھ کر لوگوں کو گندایا کرو رہے ہوں جاؤ کہیں اور جا کر بیٹھو یا اپنے ہاتھوں پر قابو رکھو۔“ اس کا غصہ پھر عود کر آیا۔ اس نے نٹھونکال کر چہرے سے کچھ صاف کرنا شروع کیا تھا۔

”بی بی! تو گندگی سے کیوں ڈرتی ہے۔ تجھے کیا لگتا ہے، یہ کچھ تجھے کسی کی نظر سے اوجھل کر دے گا۔ تجھے لگتا ہے اتنا سا کچھ اس شخص کی محبت کو ختم کر دے گا۔“

اس بار اس نے عجیب سے لہجے میں سلمان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔

”اس شخص کی پرواہ نہ کر۔ اللہ کی پرواہ کر۔ اللہ کو کچھ اور گندگی سے غرض نہیں ہوتی۔ اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے۔ ہمیشہ رہتا ہے اور اس نظر کو کچھ کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ دیکھو دیکھو۔“

وہ ایک دم اٹھ کر کچھ کے اس گڑھے کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور پھر اس نے کچھ نکال نکال کر اپنے چہرے اور لباس پر ملنا شروع کر دیا۔

”دیکھو، میں تو کچھ سے نہیں ڈرتا۔ میں تو گندگی سے خوف نہیں کھاتا۔ جانتا ہوں۔ اس کی نظر اس کچھ اور گندگی پر نہیں جائے گی۔ وہ صرف میرے وجود کو دیکھے گا۔“

اس بار بات کرتے ہوئے وہ ہذیبائی کیفیت میں تھا۔ وہ نٹھو کے ساتھ چہرہ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھتی رہی اور اس کے اشتعال میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔ ”میں جس کی نظر میں ہوں، میرے لیے کافی ہے۔ مجھے جس کی محبت چاہئے، مل چکی ہے مجھے اور کسی کی محبت کی پرواہ نہیں ہے۔“

”یہ تو دروازہ ہے، دروازے کا کام رستہ دینا ہوتا ہے یا رستہ روکنا، تیرا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ تیرا ہی کیا ہر عورت کا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ اسے لے کر کیا کرے گی تو یہ گل نہیں ہے بی بی! یہ گل نہیں ہے۔ تو گل کی خواہش کیوں نہیں کرتی وجود کی طلب کیوں ہے تجھے۔ ذات کی چاہ کیوں نہیں ہے؟“ اس کا ہاتھ ایک بار پھر سلمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

”تم بھکاری لوگ رستے میں بیٹھ جاتے ہو اور پھر کہو اس کرنا شروع کر دیتے ہو چلو سلمان۔“

اس نے یک دم سلمان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چلنا شروع کر دیا جواب تک بالکل خاموشی سے ساری گفتگو منتار ہاتھا۔

”ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے اور ہر ایک خود کو مالک سمجھتا ہے جب تک ٹھوکر نہیں لگتی، جب تک گھٹنوں پر نہیں گرتا۔ اپنی



اوقات کا پتا ہی نہیں چلتا۔ وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا، بس ذات بھکاری نہیں ہو سکتی۔ وجود کے مقدر میں مانگنا ہے، ذات کا وصف دینا ہے۔ میں کیا، تو کیا بی بی! سب بھکاری ہیں۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، کبھی نہ کبھی بھکاری بننا ہی پڑتا ہے۔ مانگنا ہی ہوتا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا وہ خواہش کا ختم ہو جانا مانگتا ہے۔“

وہ فقیر بلند آواز میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ اوپر سڑک کی طرف جاتے ہوئے بھی اس کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں میں آرہی تھی اور اس کے اشتعال میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”تم بھی عجیب ہو مسلمان! تم سے اتنا نہیں ہوا کہ اسے جھڑک ہی دو، وہ کس طرح مجھ سے بات کر رہا تھا۔ مگر تم بالکل چپ کھڑے رہے۔“ اس نے ایک دم مسلمان سے کہنا شروع کیا تھا۔

”میں کیا کہتا اسے، وہ کوئی پاگل تھا۔ اس سے بحث کر کے مجھے کیا ملتا؟ تم نے بھی تو بحث کی ہے کیا فائدہ ہوا؟ بہتر تھا، تم بات بڑھاتیں ہی نہ خاموشی سے نظر انداز کر کے وہاں سے آ جاتیں۔“

مسلمان نے اس سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات پر کچھ اور بھڑک اٹھی۔ ”اُسے نظر انداز کر کے آ جاتی تاکہ وہ کسی اور کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتا، پاگل نہیں تھا وہ، ڈھونگی تھا۔ دیکھا نہیں کس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ کیا باتوں سے اس کے پاگل پن کا پتہ چلتا ہے؟ نئے نئے طریقے اپنائے ہوئے ہیں ان لوگوں نے بھیک مانگنے کے۔ ہر جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور تمہارے جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی ان کا حوصلہ اتنا بڑھ جاتا ہے۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا، میں وہی پتھر اٹھا کر اس کے سر پر ماروں۔ اسے پتا تو چلے۔ اندھا ہے وہ لوکا پٹھا۔“ اس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”کول ڈاؤن یا ر! اب اتنا زیادہ غصہ کرنے کا کیا فائدہ ہے، جو ہو گیا ہو گیا۔ اب ان باتوں کو دہرانے کا کیا فائدہ، گھر چل رہے ہیں، تم کپڑے بدل لینا بلکہ نہ لینا۔ یہ کچھ ختم ہو جائے گی تم خوا خواہ اس بات کو سر پر سوار کر رہی ہو۔“

مسلمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ”خیر میں کسی بھی بات کو خوا خواہ سر پر سوار نہیں کیا کرتی۔ جو بات ٹھیک تھی، میں نے وہی کہی ہے۔ آئندہ کم از کم کسی دوسرے کے ساتھ ایسا کرے ہوئے دس بار سوچے گا۔“ اس کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا مگر اس نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی مسلمان نے بھی اس کے خاموش ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا گھر پہنچنے تک اس کے ذہن سے یہ بات نکل چکی تھی۔

اس واقعہ کو تقریباً چھ ماہ گزر گئے جب اس نے مسلمان میں کچھ تبدیلیاں نوٹ کرنی شروع کی تھیں۔ شادی کے ڈھائی سال اور اس سے پہلے کے تین سال جو اس نے مسلمان کے ساتھ گزارے تھے۔ ان میں اس نے مسلمان کو ایک بے حد ٹھنڈے مزاج کا انسان پایا تھا۔ وہ بڑی سے بڑی بات پر بھی فوری ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتا تھا اور نہ ہی غصہ میں آتا تھا بلکہ اپنی ناراضگی کا اظہار بھی بڑے دھیمے لہجے میں کرتا تھا لیکن اب وہ ایک دم چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑکنے لگا تھا۔

فلک نے پہلے اس بات پر اتنی توجہ نہیں دی۔ لیکن پھر جب ایسا اکثر ہونے لگا تھا تو وہ کچھ پریشان ہوئی لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر سب کچھ نظر انداز کرنے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے فیکٹری کے کسی معاملے کی وجہ سے وہ پریشان ہو۔ اس نے مسلمان سے یہ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر ان

دنوں وہ اس کی کسی بھی بات کا ڈھنگ سے جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ ہر وقت جھنجھلایا رہتا تھا اور کسی بھی چھوٹی سی بات پر اسے فلک پر اپنا غصہ اتارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس نے پہلے کی طرح فلک کے ساتھ اس کے میکے جانا چھوڑ دیا تھا بلکہ اسے فلک کے وہاں جانے پر بھی اعتراض ہونے لگا تھا اس کا خیال تھا کہ فلک کو اپنے گھر سے زیادہ اپنے ماں باپ کے گھر میں دلچسپی تھی اور وہ اپنا زیادہ وقت وہاں گزارنا چاہتی تھی۔ جب ایک دو بار اس نے اس طرح کی باتیں کیں تو فلک نے بہتری اسی میں سمجھی کہ وہ فی الحال اپنے والدین کے گھر جانا چھوڑ دے اس کا خیال تھا کہ اگر اس کی ناراضگی اور رویے میں تبدیلی کی وجہ یہ ہے تو یہ وجہ ختم ہونے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا، اس کے اعتراض اور نکتہ چینیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے کی طرح اسے وہ ہر شام اسے اپنے ساتھ باہر لے کر نہیں جاتا تھا اور فلک کے اصرار پر وہ بگڑ جاتا تھا اس کا خیال تھا کہ اسے صرف باہر گھومنے پھرنے سے دلچسپی ہے گھر کا کوئی خیال نہیں۔

یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا اور فلک حقیقت میں پریشان ہو گئی تھی پھر ان ہی دنوں وہ گھر سے رات دیر تک غائب رہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے اس کی عادت تھی کہ وہ صبح نو بجے فیکٹری جاتا اور شام پانچ بجے گھر آ جاتا۔ اگر اسے ایمر جنسی میں کہیں اور جانا پڑتا یا فیکٹری میں رکنا پڑتا تو وہ فلک کو اطلاع دے دیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ پانچ بجے کے بجائے رات دس گیارہ بجے واپس آنے لگا تھا۔ اگر فلک اس سے پوچھنے کی کوشش کرتی تو وہ کہتا۔ ”میری مرضی، میں جب چاہوں گھر میں آؤں اور ضروری نہیں ہے کہ میں جہاں جاؤں، تمہیں اطلاع دے کر جاؤں۔ میں تمہارا ملازم نہیں ہوں۔“

فلک اس کی بات سے زیادہ اس کے لہجے پر رو ہانسی ہو جاتی۔

”لیکن میں پریشان ہو جاتی ہوں۔“

”تم کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں ننھا بچہ نہیں ہوں۔“ وہ بات ہی ختم کر دیتا تھا۔

فلک اس صورت حال سے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ رشنا شادی کے بعد کوئٹہ چلی گئی تھی وہ اس کے ساتھ یہ سب ڈسکس نہیں کر سکتی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے مریم سے بات کی تھی۔ وہ اس کی بات پر جیسے اچھل پڑی تھی۔

”اتنے مہینوں سے سلمان کا یہ رویہ ہے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

”میں نے تمہیں کیا کسی کو بھی نہیں بتایا۔ میرا خیال تھا وہ کسی وجہ سے پریشان ہے اس لیے وقتی طور پر اس طرح ہو گیا ہے مگر اب تو۔“

”تم احق ہو جو تم نے اسے اتنی ڈھیل دے دی۔ یہ سب اس کے آگے پیچھے پھرنے کا نتیجہ ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی اور لڑکی کے چکر میں ہے۔“ وہ مریم کے انداز سے پرہکا بکا رہ گئی۔

”تم کیا کہہ رہی ہو مریم؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سلمان اس طرح کا نہیں ہے اور ابھی تو ہماری شادی کو صرف ڈھائی تین سال ہوئے ہیں۔“ وہ جیسے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

”تم اگر حقیقت کا سامنا نہیں کرنا چاہتیں تو اور بات ہے ورنہ اس طرح بات بے بات لڑنا، تم میں نقص نکالنا، تمہارے کاموں پر اعتراض



کرنا، راتوں کو دیر تک گھر سے باہر رہنا اس سب کا مطلب ایک ہی ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی اور موصوفہ آچکی ہیں۔“ وہ ہونٹ بنی مریم کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تو پھر اب میں کیا کروں مریم؟ اب کیا ہوگا؟“

کچھ لمحے گزرنے کے بعد اسے مریم کی باتوں پر یقین آنے لگا تھا۔

”کچھ نہیں ہوگا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ تم ذرا خود پر پہلے سے زیادہ دھیان دو، ذرا اچھے اور ٹھیک ٹھاک قسم کے کپڑے پہنو۔ اس پر زیادہ توجہ دو۔ جو سیکے تو اس کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے کہیں باہر چلی جاؤ جن باتوں پر اسے اعتراض ہے، وہ چیزیں ہونے ہی نہ دو کوشش کرو کہ اسے کسی بات پر اعتراض کا موقع ہی نہ ملے اور پھر بھی اگر وہ ٹھیک نہیں ہوتا تو اس سے صاف صاف بات کرو کہ اس کے اس رویے کی کیا وجہ ہے وہ کیا چاہتا ہے۔“

مریم نے اسے جیسے گرتا نہ شروع کر دیئے تھے۔ وہ بڑے اٹھاک سے اس کی باتیں سنتی رہی، اس کے گھر سے واپسی پر وہ سیدھا گھر جانے کے بجائے بیوٹی پارلر چلی گئی تھی۔ اس نے وہاں جا کر اپنی ہنر اسٹائل تبدیل کروایا۔

بالوں میں اسٹریکس ڈلوائیں۔ آئی براؤن کی ہیپ کو کچھ اور ٹیکھا کروایا۔ واپس گھر آنے کے بعد اس نے سلمان کا پسندیدہ لباس پہنا تھا مگر میک اپ کرنے کے بعد اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھا اسے یقین تھا کہ وہ کبھی بھی اتنی خوبصورت اور فریش نہیں لگی تھی جتنی آج لگ رہی تھی۔

وہ رات گیارہ بجے آیا تھا اور خلاف معمول اس نے فلک کو لاؤنج میں دیکھا تھا۔ اس نے کچھ حیرانی سے اس کی تیاریوں کو دیکھا تھا اور پھر ایک لفظ بھی بولے بغیر بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ کچھ دل گرفتہ ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اتنی خوبصورت لگ رہی ہے کہ وہ چند لمحوں تک تو اس سے نظر نہیں ہٹا پائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی نظر بہت سرسری تھی۔

وہ اس کے پیچھے بیڈ روم میں چلی آئی۔ ”میں کھانا لگا دوں؟“ خود پر قابو پا کر اس نے بڑے ہشاش بشاش انداز میں پوچھا تھا۔

وہ ایک بار پھر ٹھٹھکا تھا۔ ”کیا میں تمہیں احمق نظر آتا ہوں کہ اس وقت کھانا کھانے بیٹھوں گا۔“

”لیکن میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“

”کیوں نہیں کھایا؟ روز تو کھا لیتی ہو تم پھر آج اس خاص عنایت کی وجہ کیا ہے؟ بہر حال کھانا نہیں کھایا تو کھالو۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا شوز اتار رہا تھا۔

”میں نے آج تمہاری پسند کی ڈشز بنوائی ہیں۔“ وہ اب مایوس ہو رہی تھی۔

”مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے ان ڈشز میں اور ہاں ایک بات اور۔“ وہ واش روم کی طرف جاتے جاتے مڑا تھا۔

”کیا سارا دن اس تماشے سے تمہارا دل نہیں بھرتا جواب تم رات کو بھی اسے لا کر بیٹھ گئی ہو۔ تم بیوی ہو، ماؤل یا ایکٹر لیس نہ بنو۔“ اس کا

اشارہ اس کے میک اپ اور کپڑوں کی طرف تھا۔ وہ سن ہو گئی تھی۔

”اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ پہلے تو۔ کیا واقعی کوئی دوسری لڑکی۔“

وہ ایک بار پھر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ سلمان انصر کے معمولات کو اس کی کسی ”کوشش“ نے نہیں توڑا تھا۔ وہ جس طرح چاہتا رہتا جہاں چاہتا جاتا، جب چاہتا گھر آتا اور جب دل چاہتا گھر نہ آتا۔ دن بدن فلک کی فرسٹریشن میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے، مجھے بتاؤ۔ سلمان تمہیں کیا ہوا ہے؟“

وہ اس دن اس کے انتظار میں رات کے دو بجے تک بیٹھی رہی تھی اور اس کے آتے ہی اس نے اس سے پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جواب دیئے بغیر سیدھا بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ وہ لپکتی ہوئی اس کے پیچھے گئی۔ سلمان اپنی نائی کھول رہا تھا۔

”سلمان! میرے ساتھ اس طرح کیوں کر رہے ہو؟ میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟“ وہ اس کے مقابل آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ سرد نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بازو پکڑ کر سامنے سے ہٹا کر ڈرینگ میں چلا گیا۔ وہ برف کے بجسے کی طرح وہیں کھڑی رہی۔

”میں تمہارے سامنے آتی تھی تو سلمان! تمہارا سانس رک جاتا تھا۔ میں بالقابل آتی تھی تو تمہاری نظر کو اسیر کر لیتی تھی تمہارے وجود کو پہناتا کر دیتی تھی۔ تم میرے معمول بن جاتے تھے۔ اب تم میں یہ طاقت کہاں سے آ گئی کہ تم مجھے سامنے سے ہٹا دو۔ میرا جادو توڑ دو۔ مجھ سے نظر چرا جاؤ۔ سلمان انصر میرا خدشہ ٹھیک ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان کوئی تیسرا آ گیا ہے، نہیں آ گئی ہے۔ کوئی فلک سے بڑھ کر، کوئی فلک سے بہتر اور اب تمہارے وجود پر کیا اسکا جادو چلا کرے گا۔“

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زور زور سے چلائے چیخے اسے بتائے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اسے یاد دلانے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا تھا۔ وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ چند منٹ بعد نائٹ ڈریس میں ملبوس ڈرینگ سے باہر آ گیا تھا۔ فلک نے بیگی آکھوں کے ساتھ اس کے چہرے کو پڑھنا شروع رک دیا تھا اسے وہ بے حد تھکا بہت بھابھا لگا تھا۔ سلمان نے اپنے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے پر دوڑائی تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے وہ آنکھیں چرا کر اپنے بیڈ کی طرف چلا گیا۔ فلک کے دل پر جیسے کسی نے گھونر مارا تھا۔

”تو اب میرے آنسوؤں میں بھی اتنی طاقت نہیں رہی کہ یہ تمہیں باندھ لیں۔ تمہیں ہلنے نہ دیں۔ کیا ہر چیز آج ہی بے اثر ہو جائے گی۔“

”فلک! اور کچھ بھی کرو مگر میرے سامنے رویا مت کرو۔ میں تمہارے آنسو برداشت نہیں کر سکتا ہوں، دنیا میں کون سی چیز ہے جو تمہیں رونے پر مجبور کرتی ہے، مجھے بتاؤ۔ میں وہ چیز ہی ختم کر دوں گا۔ میں نے تم سے شادی تمہیں رلانے کے لیے نہیں کی ہے۔ تمہارے آنسو دیکھنے کے لیے نہیں کی ہے۔ تم جانتی ہو تمہاری آنکھوں کو خدانے آنسوؤں کے لیے نہیں بنایا ہے تمہاری آنکھوں کو ہنسنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ فلک! رونے کے لیے نہیں۔ تم روتی ہو تو مجھے لگتا ہے جیسے دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا، جیسے دنیا ختم ہو گئی ہے۔“

اسے یاد آ رہا تھا، یہ سب اسی شخص نے تو کہا تھا اور آج اس کو میرے آنسو نظر نہیں آئے۔ آج میرے آنسو دیکھ کر کیا اس کے لیے دنیا ختم نہیں ہوئی؟ کیا اس کا سب کچھ باقی رہ گیا ہے۔



وہ ایک دم سسک سسک کر رونے لگی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹ کر لاسٹ آف کر چکا تھا۔

”فارگاڈ سیک بند کرو یہ رونادھونا۔ کیا چاہتی ہو تم، کیا میں یہاں نہیں آیا کروں۔ کیا اس گھر سے چلا جاؤں کہیں۔“

وہ ایک دم اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بیڈ پر اپنا سر پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔ فلک نے ہاتھ بڑھا کر لاسٹ آن کر دی۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”تمہیں میں اتنی بری کیوں لگنے لگی ہوں سلمان! بات کرتی ہوں تو تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ ہنستی ہوں تو تمہیں برا لگتا ہے۔ روتی ہوں تو تم چلاتے ہو۔ اتنی نفرت کیوں ہو گئی ہے تمہیں مجھ سے ایسے تو کبھی بھی نہیں تھے۔ تم مجھے دیکھنا نہیں چاہتے میری آواز سننا نہیں چاہتے تم ایسے نہیں تھے۔ سلمان! تم کبھی بھی ایسے نہیں تھے۔“

اس نے بات کرتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھ گیا تھا۔

”میں خود نہیں جانتا، مجھے کیا ہو گیا ہے؟“

اس نے فریج کے پاس جا کر پانی کی بوتل نکالی تھی اور اسے کھول کر پانی کے چند گھونٹ پیے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی بنا پلکیں چپکائے اسے دیکھتی رہی، وہ اب بوتل ہاتھ میں لئے بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

”کیا تم کسی اور سے محبت کرنے لگے ہو؟“

اس نے سانس روکتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ وہ ایک دم اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔ اس کے چہرے پر شکست خوردگی تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ آ کر اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ابھی تک سانس روکے پلکیں چپکائے بغیر اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”کیا کوئی اور؟“ اس نے ایک بار پھر پوچھنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

”ہاں فلک! میں کسی اور سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

اسے پہلی بار پتہ چلا تھا، کانوں میں سیسہ اترتا کسے کہتے ہیں۔ وہ بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھے گئی۔ ”کیا فلک کے سوا سلمان انصر کو کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟ کیا فلک کے ہوتے ہوئے سلمان انصر کو کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟“ وہ جیسے لنگ ہو گئی تھی۔

”اب کیا پوچھنا چاہئے؟ وہ کون ہے؟ کیسی ہے؟ یا پھر یہ کہ تمہیں اس سے محبت کیسے ہوئی؟ کیوں ہوئی؟ یا یہ کہ تم اس سے کہاں ملے؟ کیوں ملے؟ یا پھر یہ کہ تم نے مجھ سے یہ سب کیوں چھپایا؟ مجھے دھوکا کیوں دیا؟“

وہ سوالوں کا انبار ذہن میں لیے لرزتے جسم کے ساتھ وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔

”میں نہیں جانتا، یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا، تمہارے ساتھ بے وفائی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ یقین کرو فلک! میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کیا۔“

وہ سر ہاتھوں میں تھامے بول رہا تھا۔ وہ کسی مجسمے کی طرح اسے دیکھتی رہی۔

”وہ میری فیکٹری میں کام کرتی ہے، پیکنگ ڈپارٹمنٹ میں اس کا نام تابندہ ہے۔“

”کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟“ اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”خوب صورت؟ تم نہیں جانتیں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔ میں اسے اگر دن میں ایک بار نہ دیکھوں تو یقین کرو، میں کچھ اور دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ یقین کرو فلک! میں چاہوں بھی تو کچھ اور دیکھ نہیں پاتا۔ مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تم نے کبھی کسی چمکاؤ کو دن کے وقت دیکھا ہے فلک! میں اس کا چہرہ دیکھے بغیر بالکل ویسا ہی ہو جاتا ہوں۔“

وہ بول رہا تھا، فلک کا چہرہ آنسوؤں سے ایک بار پھر بھگینے لگا تھا۔

”مسلمان! کیا وہ تم سے، مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے؟“ اس نے ڈوبے ہوئے جہاز کے کسی بادیان کو کھینچنے کی کوشش کی تھی۔

”ہاں، وہ کرتی ہے، وہ دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ یہی کہتی ہے اور مجھے اس کی باتوں پر یقین ہے۔“ وہ اب اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

”کوئی تمہیں مجھ سے زیادہ کیسے چاہ سکتا ہے؟“

”وہ چاہتی ہے، تابندہ چاہتی ہے۔ میں جانتا ہوں۔“

”وہ جھوٹ بولتی ہے مسلمان! وہ غلط کہتی ہے۔“ اس نے کسی ننھے بچے کی طرح روتے ہوئے مسلمان کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

”نہیں، وہ جھوٹ نہیں بولتی۔ تابندہ کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتی۔ مجھے اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف پر یقین ہے۔ میں نہیں جانتا، ایسا کیوں ہے مگر فلک! وہ بولتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے، اس پر اعتبار کرنے کو۔ میرا دل گواہی دیتا ہے اس کے ایک ایک لفظ کی سچائی کی۔ اس پر یقین کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے جیسے اس سے محبت کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔“ وہ کسی آرمی کے ساتھ اسے کاٹ رہا تھا۔

”تم اس سے محبت کیسے کر سکتے ہو مسلمان! تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔“ اس نے جیسے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

”مجھے نہیں پتا میں تم سے محبت کرتا تھا یا نہیں مگر مجھے اس سے محبت ہے۔ نہیں محبت نہیں مجھے عشق ہے، یاد ہے۔ تم نے ایک بار کہا تھا فلک! محبت تو رگوں میں خون، بن کر بہتی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو مجھے پتا چلا، یہ کیسے ہوتا ہے؟ فلک! میں اسے دیکھتا ہوں تو ہپنا نا ز ہو جاتا ہوں، وہ جو کہتی ہے میں وہی کرتا ہوں۔ وہ جو چاہتی ہے۔ مجھ سے وہی ہوتا ہے۔ میں اس کی آواز نہ سنوں تو مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی وہ ہنستی ہے تو اس کے ہر قہقہے کے ساتھ میرے دل کی ایک دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ وہ قدم اٹھائے تو میرا دل چاہتا ہے میں زمین بن جاؤں۔ صرف اس لیے کہ اس کے پیروں کے نیچے آ جاؤں وہ مجھ پر سے گزرے اس کے پیروں کو بھی اگر کوئی چیز چھوئے تو وہ میرا وجود ہو۔ وہ ر کے تو میرا دل چاہتا ہے، دنیا کی ہر حرکت کرنے والی چیز کو روک دوں، ہر چیز کو چاہے وہ انسان ہو یا مشین یا پھر ہوا یا بہتا پانی۔ میں اسے سب کچھ دے دیتا چاہتا ہوں سب کچھ، ہر چیز جو میرے پاس ہے۔ میں اسے دے دیتا چاہتا ہوں چاہے وہ اسے رکھے یا آگ لگا دے یا کسی کو دے دے۔ مجھے پرواہ نہیں بس میں اسے خوش کرنا چاہتا ہوں۔ اسے بتانا چاہتا



ہوں کہ مجھے، مجھے اس سے عشق ہے۔ تم نہیں جانتیں فلک وہ اگر ایک خنجر لے کر میرے وجود کو کاٹنا شروع کر دے۔ ایک ایک پور، انگلی، ہاتھ، کلائی، بازو، کہنی، کندھا تو میں میں اسے اپنا ایک ایک حصہ دیتا رہوں گا۔ کسی ہچکچاہٹ، کسی اعتراض کے بغیر اسے حق ہے چاہے تو مارے چاہے تو کاٹے چاہے تو جلا دے۔ مگر سب اپنے ہاتھ سے کرے اپنے ہاتھ سے میں نہیں جانتا فلک، یہ سب کیسے ہوا ہے؟ کیوں ہوا ہے مگر یہ سب ہو چکا ہے۔ میں تابندہ کے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ ہر چیز کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ مگر اس کے بغیر نہیں۔ اس کے بغیر رہوں گا تو نہ مجھے کچھ نظر آئے گا، نہ میں کچھ سن سکوں گا نہ کچھ بول سکوں گا۔ میں ایسی زندگی گزارنا نہیں چاہتا فلک! میں ایسی زندگی گزارنا نہیں چاہتا۔“

وہ اب رد رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا اس نے کبھی مسلمان اصر کو رو دے دیکھا ہو، یوں ہلک ہلک کر پھوٹ پھوٹ کر زار و قطار اور وہ بھی ایک عورت کے لیے۔ ایک دوسری عورت کے لیے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اسے بتائے کہ میرے لیے تم وہی سب کچھ ہو جو وہ تمہارے لیے ہو گئی ہے۔ میں بھی تمہیں دیکھے بغیر اندھی ہو جاتی ہوں۔ میں بھی تمہاری آواز سننے بغیر کچھ اور سننے کے قابل نہیں رہتی۔ میں بھی تم سے باتیں کیے بغیر کسی دوسرے سے بات نہیں کر سکتی پھر تمہیں یہ سب کچھ پتا کیوں نہیں چلا۔ مگر وہ بتے آنسوؤں کے ساتھ خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی تھی۔

”میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں فلک! تم اجازت دو گی تو بھی، نہیں دو گی تو بھی میں اس سے شادی کر لوں گا۔ مگر میں چاہتا ہوں یہ کام تمہاری رضامندی سے ہو۔ ہم دونوں نے بہت سا وقت اکٹھے گزارا ہے۔ اچھا وقت گزارا ہے۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں تمہیں ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا مگر میں تابندہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم تو محبت کرتی ہو مجھ سے۔ جو محبت کرتے ہیں وہ تو بہت بڑی بڑی قربانیاں دے دیتے ہیں کیا تم مجھے اس سے شادی کی اجازت نہیں دے سکتیں۔“

وہ اب اس کا ہاتھ تھامے اس سے کہہ رہا تھا۔ صور اسرافیل کیسا ہوگا؟ وہ اب اندازہ لگا سکتی تھی۔

”میں بھی تو تم سے محبت کرتی ہوں، اتنی نہیں بلکہ اس سے زیادہ محبت جتنی وہ لڑکی تم سے کرتی ہے۔“

اس نے اپنے مہروں کو آگے بڑھانے کی آخری کوشش کی تھی۔ وہ مایوسی سے اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”مگر مجھے تمہاری محبت کی ضرورت نہیں ہے، مجھے اس کی محبت کی ضرورت ہے۔“

”میں نے کون سی غلطی کی ہے مسلمان؟“

”مجھے نہیں پتا بس مجھے اس سے محبت ہے۔“

”میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا، پچھلے تین سال میں کیا نہیں کیا؟“

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے، مجھے بس وہ چاہئے۔“

”میں نے پچھلے تین سال میں زندگی کو دیے گزارا ہے۔ جیسے تم نے چاہا ہے پھر بھی تم مجھ سے خوش نہیں ہو۔ بیزار ہو گئے ہو۔“

”تو میں کیا کروں، میں نے تم سے نہیں کہا تھا تم نے یہ سب اپنی مرضی سے کیا۔ مگر مجھے صرف تابندہ کی ضرورت ہے۔“

”تم مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔ مجھ سے محبت کرنے لگو مجھے ٹھکراؤ نہ؟“

”مجھے تمہاری ضرورت ہی نہیں۔ مجھے تمہاری کوئی بات کوئی چیز خوش نہیں کر سکتی کیونکہ تم تابندہ نہیں ہو۔“

”میں نے تم سے محبت کی ہے، جو محبت کرتے ہیں، کیا انہیں اس طرح ٹھوکر ماری جاتی ہے۔ کیا تم مجھے اس طرح چھوڑ دو گے؟“

”جو بھی چیز میرے اور تابندہ کے درمیان آئے گی، میں اسے چھوڑ دوں گا۔ مجھے پروا نہیں ہے کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔

میرے لیے بس وہ کافی ہے۔“

”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

”مگر مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تابندہ کی ضرورت ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تمہیں بائنا نہیں چاہتی کسی کے ساتھ تمہاری محبت میں کمی برداشت نہیں کر سکتی۔“

”تم چاہو گی تو میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا لیکن تمہیں مجھ سے دستبردار ہونا ہی پڑے گا۔ تابندہ کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔“

”میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ خودکشی کر لوں گی۔“

”یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو۔“

”تم نہیں جانتے تم میرے لیے کیا ہو؟“

”مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“

”تابندہ میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتا بس میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“

”پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟“

”پتا نہیں، مجھے نہیں کرنی چاہئے تھی، اگر مجھے علم ہوتا کہ میری زندگی میں تابندہ آئے گی تو میں کبھی تم سے شادی نہ کرتا۔“

”میرا وجود تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔“

”نہیں، یہ میرے لیے کچھ نہیں ہے سب کچھ تابندہ ہے۔“

ہر مہرہ باری باری ہٹا گیا تھا۔ اس کا سانس گھٹنے لگتا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ لاؤنج میں خاموشی بھی تھی اور تاریکی بھی یہی

دونوں چیزیں اس کے اندر تھیں۔ وہ لائٹ آن کر کے صوفہ پر بیٹھ گئی۔

”دنیا میں تم سے زیادہ مکمل کوئی دوسری لڑکی نہیں ہے۔“ بہت عرصہ پہلے مسلمان کی کہی ہوئی ایک بات اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔

”اور اب مجھ سے زیادہ بہتر، زیادہ مکمل تمہیں کوئی دوسری مل گئی ہے۔“

اس نے اپنی آستین سے چہرہ رگڑا تھا۔ پھر اس کے دل میں پتا نہیں کیا آئی۔ وہ اٹھ کر دوش روم میں آ گئی۔ دیوار پر لگے ہوئے لمبے

چوڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ پھر اس نے اپنے بالوں میں لگا ہوا کلپ اتار دیا۔ اس کے سیاہ سلکی اسٹپس میں



کئے ہوئے بال کا ندھوں پر بکھر گئے تھے۔ اس نے واش بین کے فل میں سے پانی لے کر چہرے پر چھینے مارے تھے، پھر تولیہ اسٹینڈ سے تولیہ لے کر چہرے کو خشک کیا۔

”کیا میں خوبصورت نہیں رہی؟“ اس نے جیسے آئینے سے سوال کیا تھا۔ ”کیا میں بد صورت ہو گئی ہوں؟ کیا میری آنکھیں اب دلوں کو تسخیر کرنے کے قابل نہیں رہیں؟ کیا میری مسکراہٹ اپنی کشش کھو چکی ہے؟ کیا میرے ہونٹ اور ناک حسن نہیں صرف گوشت کے ٹوٹنے والے ہیں؟ کیا میری دودھیا رنگت میں کوئی فرق آ گیا ہے؟“ وہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا کر سوچتی رہی۔

”کچھ بھی نہیں بدلا، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ نہ آنکھیں نہ ہونٹ نہ رنگت نہ ناک نہ چہرہ نہ بال نہ جسم، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ پھر اس کا دل کیسے بدل گیا ہے، نظر کیسے بدل گئی ہے۔“

اس نے آئینے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ آئینہ حسن دکھا رہا تھا سلک کی سلیو لیس سفید ناکلی میں ملبوس سنگ مرمر سے تراشیدہ ایک وجود جو سر سے پاؤں تک حسن میں ڈھلا ہوا تھا۔

”کہیں کوئی عیب، کوئی نقص“ اس نے تلاش کرنا شروع کیا تھا۔ ”ہر چیز مکمل ہے پھر بھی اس نے مایوسی سے آئینے کو دیکھا تھا۔“ اگر عشق حسن سے ہوتا ہے تو میں حسن ہوں پھر وہ..... وہ تابندہ۔“

ایک آگ اس کے وجود کو اپنے حصار میں لینے لگی تھی۔

”ہاں کوئی تو بات ہوگی اس میں، کوئی تو چیز ہوگی اس میں جو سلمان کو مجھ میں ملی جو اسے مجھ سے دور لے گئی۔ جس نے اس کا دل مجھ سے پھیر دیا۔ مجھے بھی تو دیکھنا چاہئے۔ کیا ہے اس عورت میں جس نے سلمان انصرو کو یوں مسر اڑ کر دیا ہے کہ اسے دنیا نظر نہیں آتی۔ فلک شیر آگن نظر نہیں آتی۔ مجھے بھی تو دیکھنا چاہئے۔ کیا ہے ان قدموں میں جن کے نیچے وہ اپنے وجود کو مٹی بنا کر بکھیر دینا چاہتا ہے۔ صرف اس چاہ میں کہ وہ قدم اس مٹی کو چھوئیں۔ کیا وہ میرے پیروں سے زیادہ خوبصورت ہو سکتے ہیں۔“

اس نے اپنی ناکٹی کو اٹھا کر جھک کر اپنے پیر دیکھے تھے۔ وہ اتنے ہی دودھیا، اتنے ہی نرم و نازک، اتنے ہی مکمل تھے جتنا اس کے وجود کا کوئی دوسرا حصہ۔

”مجھے بھی تو دیکھنا چاہئے، وہ کیسا وجود ہے جس کے نام وہ اپنی ساری زندگی کر دینا چاہتا ہے۔ وہ کیسے ہاتھ ہیں جو اسے نخر سے کاٹ دیں تو اسے شکایت نہیں ہوگی۔ وہ کون سے ہونٹ ہیں جو بات کریں تو اسے دنیا میں کچھ اور سنائی نہیں دیتا، وہ کون سا وجود ہے جو رکے تو وہ ہوا کو روک دینا چاہتا ہے۔“ وہ ایک پھر پگھل رہی تھی۔

”اور اگر وہ..... وہ عورت مجھ سے زیادہ خوبصورت ہوئی تو..... تو پھر میں کیا کروں گی۔ کیا اسے سلمان پر قابض ہونے دوں۔ کیا اس کا رستہ خالی چھوڑ دوں۔ میں کیا کروں گی؟ ہاں میں اس حسن کو ختم کروں گی، جس نے سلمان کو پاگل بنا دیا ہے۔ میں اسے اس قابل نہیں چھوڑوں گی کہ وہ اسے دوبارہ دیکھے۔ دوبارہ اس کی طرف جائے۔ میں اس کا وہ چہرہ ہی بگاڑ دوں گی جس نے سلمان کو اپنا اسیر کیا ہے۔ وہ آنکھیں منادوں کی جس نے۔“

وہ آئینے کے سامنے کھڑی کسی پاگل کی طرح خود سے باتیں کر رہی تھی۔

بہت دیر بعد وہ جھکے جھکے قدموں سے واش روم سے باہر نکل آئی۔ لاؤنج کے صوفہ پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ آنسو ایک بار پھر چہرے پر پھیلنے لگے۔

”تم جانتے ہی نہیں، تمہیں یا تمہاری محبت کو کھونے سے بڑھ کر کوئی نشتر نہیں ہے، جو کوئی مجھے لگا سکتا ہے۔ کیا نہیں ہے میرے پاس؟ سب کچھ ہی تو ہے۔ اب اگر نہیں ہے تو صرف تم نہیں ہو۔ میں تو تمہیں اپنے سائے کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ کسی دوسری عورت کے ساتھ کیسے کر لوں۔ کیسے برداشت کر لوں کہ میرے علاوہ تم کسی اور سے بات کرو۔ کسی عورت کا ہاتھ تھامو۔ کسی اور کے آنسو پونچھو۔ کسی اور کو اپنا نام دو۔ تابندہ مسلمان! نہیں میں، تو تمہارے لباس کی ایک دھجی تک کسی کو نہیں دے سکتی۔ تمہارے پورے وجود کو کس طرح دے دوں اور وہ بھی اپنے ہاتھ، اپنی مرضی سے یہ نہیں کر سکتی۔ مسلمان انصاف! بس میں یہ نہیں کر سکتی۔ تمہارے بدلے چاہے کوئی مجھ سے سب کچھ لے لے مگر مجھے تمہارا وجود چاہئے۔ تمہیں میں کسی کو نہیں دے سکتی۔ اس عورت کو کیا محبت ہوگی تم سے اس کو تو پیہ چاہئے ہوگا۔ میں اسے پیہ ہی دوں گی۔ تمہیں خرید لوں گی اس سے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر میں اس کے چہرے کو تیزاب سے جلا دوں گی۔ اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گی کہ تم دوبارہ کبھی اس پر نظر ڈالو۔“ وہ روتے روتے پتا نہیں کس وقت سو گئی تھی۔

صبح جس وقت اس کی آنکھ کھلی، گھر میں نوکر آچکے تھے۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی، کمرہ خالی تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا، اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح آنکھیں کھولے چھت کو گھورتی ہوئی وہاں پڑی رہی پھر وہ اٹھ کر واش روم میں گھس گئی تھی۔ شاور لینے کے بعد خاص طور پر منتخب کئے ہوئے کپڑے پہن کر وہ باہر نکلی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنے بالوں میں رولرز لگانے شروع کئے وہ آج بہت خاص بن کر وہاں جانا چاہتی تھی۔ بہت ہی خاص بن کر وہ اس عورت کو دکھانا چاہتی تھی کہ مسلمان انصر کی بیوی کیا ہے، فلک کیا ہے۔

آدھ گھنٹے بعد میک اپ مکمل کرنے کے بعد اس نے رولرز اتار کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا تھا۔ بہت دیر تک وہ اپنے عکس سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ زمردی رنگ کی سلک کی ساڑھی اور ڈارک گرین کلر کے کھلے گلے کے نیٹ کے بلاؤز میں وہ ایک مکمل عورت لگ رہی تھی۔ کسی خامی، کسی کمی کے بغیر۔ اس نے بت سنجیدگی سے ایک بار پھر خود پر نظریں دوڑائی تھیں پھر اس نے Chanel-5 نکال کر گردن کے دونوں اطراف میں اس کا اسپرے کیا۔ پرس اور گلاسز اٹھا کر وہ بیڈ روم سے نکل آئی تھی۔

”راتے میں سے تیزاب کی ایک بوتل خرید لینا۔“

فیکٹری چلنے کا حکم دینے کے بعد اس نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ ڈرائیور نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ مگر جواباً کچھ نہیں کہا۔ ایک دکان سے تیزاب کی بوتل خریدنے کے بعد اس نے فلک کو تھما دی۔ اس نے کچھ دیر تک اسے ہاتھ میں تھامے رکھا تھا۔ پھر اس کا ڈھکنا کھول کر کارک نکال دیا۔ بوتل کا ڈھکن بند کر کے اس نے اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ فیکٹری پہنچنے کے بعد وہ مسلمان کے آفس کی طرف نہیں گئی تھی بلکہ ایڈمن آفس کے



کمرے میں چلی گئی تھی۔

الیاس صاحب اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر گڑبڑا گئے تھے۔

”میڈم! آپ یہاں؟“

”ہاں، مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔“

وہ خود کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ الیاس صاحب کچھ نرمی سے ہو کر بیٹھ گئے۔

”پیکنگ ڈپارٹمنٹ میں تابندہ نام کی کوئی لڑکی ہے؟“

چند لمحے دفتر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بہت سرد لہجے میں ان سے پوچھا تھا۔ وہ اس کے سوال پر کچھ اور نرمی سے ہو گئے تھے۔

”میڈم! وہاں تو بہت سی لڑکیاں ہوں گی، جن کے نام تابندہ ہیں آپ کس لڑکی کا پوچھ رہی ہیں؟“ اس نے اپنی نظریں ان کے چہرے پر

گاڑ دیں۔ وہ اور پریشان ہوئے تھے۔

”میں سلمان انصروالی تابندہ کا پوچھ رہی ہوں۔“

اسنے ڈائریکٹ ریفرنس پر ان کے چہرے پر پسینے آنے لگے تھے۔

”کیوں کیا یہاں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے، جس کے ساتھ سلمان انصر۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”میڈم! دیکھیں، مجھے تو اس بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ میں تو۔“

اس نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔ ”اگر مجھے گھر میں بیٹھ کر اس چکر کا پتا چل سکتا ہے تو میں یہ تو نہیں مان سکتی کہ آپ کو ان سب باتوں کا پتا

نہ ہو۔ آفر آل آپ ایڈمن آفیسر ہیں۔ باس اور ورکرز کے روابط کا آپ کو پتا نہیں ہوگا تو کس کو پتا ہوگا۔ بہر حال، میں آپ کو کوئی الزام نہیں دے

رہی ہوں۔ میں صرف اس لڑکی سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ اسے بلوائیں۔“

اس نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔ اس بار الیاس صاحب کے چہرے پر ندامت نمایاں تھی۔

”میڈم! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں لیکن میں بے بس تھا۔ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ ورکرز کو تو سمجھا سکتے ہیں مگر باس کو

نہیں۔ میں نے سلمان صاحب سے بات کی تھی کہ ان کے اور اس لڑکی کے بارے میں بہت سی باتیں ہو رہی ہیں، مگر انہیں اس کی پرواہ ہی نہیں

ہے۔ وہ اسے ہر روز چھٹی کے وقت ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ وہ پیکنگ کا کام کرتی تھی مگر سلمان صاحب نے اسے شعبہ کا انچارج بنا دیا ہے۔ میرے

بات کرنے پر صاحب نے مجھے بری طرح جھڑک دیا ان کا خیال ہے کہ مجھے ان سے سب چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔ مجھے صرف اپنے

کام سے کام ہونا چاہئے۔“

الیاس صاحب نے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

”آپ اسے بلائیں۔“ اس نے ایک بار پھر ان سے کہا تھا۔ انہوں نے تیل بجا کر چڑا سی کو بلایا اور پھر اسے اس لڑکی کو بلانے کے لیے

بھیج دیا۔

چڑا سی کے جانے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

”میں یہاں آپ کی وضاحتوں کے لیے نہیں آئی ہوں، آپ خاموش رہیں۔“ اس نے بڑے خشک لہجے میں ان سے کہا تھا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ سر جھکا کر رہ گئے۔ وہ تیز ہوتی ہوئی دھڑکن کے ساتھ اس لڑکی کا انتظار کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ بے اختیار اپنی سیٹ سے کھڑی ہو کر پیچھے مڑی اور پھر جیسے وہ پتھر کی ہو گئی تھی۔

”سر! آپ نے مجھے بلوایا ہے؟“ اس نے الیاس صاحب سے کہا تھا۔

”ہاں میڈم تم سے.....“

”اے بھجوا دیں۔“ وہ جیسے کسی پاتال سے بولی تھی۔ سب کچھ دھواں دھواں ہوتا جا رہا تھا۔ اسے اپنا جسم مفلوج ہوتا ہوا لگا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے فلک کو دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ سانس روکے بے حس و حرکت کسی مجسمے کی طرح ابھی تک ویسے ہی کھڑی تھی۔

”تم جانتیں نہیں وہ کیا ہے۔ میں اگر اسے نہ دیکھوں تو میں کچھ اور دیکھنے کے قابل نہیں رہتا۔ تم نے کبھی کسی چگا دڑ کو دن کے وقت دیکھا ہے۔ میں اس کا چہرہ دیکھے بغیر بالکل ویسا ہی ہو جاتا ہوں۔“ اس کے کانوں میں کسی کی آواز آ رہی تھی۔

”یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا فلک! محبت تو رگوں میں خون بن کر بہتی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو مجھے پتا چلا، یہ کیسے ہوتا ہے۔ وہ قدم اٹھائے تو میرا دل چاہتا ہے۔ میں زمین بن جاؤں تاکہ اس کے پیروں کو بھی اگر کوئی چیز چھوئے تو وہ میرا وجود ہو۔ تم نہیں جانتیں فلک! وہ اگر ایک خنجر لے کر میرے وجود کو کاٹنا شروع کر دے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اسے حق ہے چاہے تو مار لے، چاہے تو کاٹ لے چاہے تو جلادے۔ مگر سب کچھ اپنے ہاتھ سے کرے۔“ ہر لفظ اس کے چہرے کو تاریک کرتا جا رہا تھا۔

ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے اور ہر ایک خود کو مالک سمجھتا ہے جب تک ٹھوکر نہیں لگتی، جب تک گھٹنوں پر نہیں گرتا اپنی اوقات کا پتا ہی نہیں چلتا۔ وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا بس ذات بھکاری نہیں ہوتی۔ وجود کے مقدر میں مانگنا ہے۔ ذات کا وصف دینا ہے۔ میں کیا تو کیا مینی بی! سب بھکاری ہیں۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، کبھی نہ کبھی تو بھکاری بننا ہی پڑتا ہے۔ مانگنا ہی ہوتا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا، وہ خواہش کا ختم ہونا مانگتا ہے۔“

اس کا وجود جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھا۔

”اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے۔ ہمیشہ رہتا ہے اور اس نظر کو کچھڑی پر واہ نہیں ہوتی۔“

چھ ماہ پہلے دریا کے کنارے اس فقیر کے کہے گئے لفظ اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

”ہاں، ساری بات نظری ہی کی تو ہے جس سے اس نے مجھے محروم کر دیا ہے اور اس عورت کو نوازدیا ہے ورنہ سلمان انصر کبھی اس عورت کو تو نہ چاہتا۔ مگر یہ تو اللہ ہے نا جس نے میرے چہرے سے نظر اٹھالی ہے پھر سلمان انصر کو کیا نظر آئے۔“ وہ بڑبڑانے لگی تھی۔



”میڈم! آپ ٹھیک تو ہیں؟“

اسے الیاس صاحب کی آواز آئی تھی۔ اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا تھا۔ الیاس صاحب کو اس کی آنکھوں میں وحشت کا ایک عجیب عالم نظر آیا تھا۔ وہ نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ وہ چند لمبے کچھ کہے بغیر انہیں دیکھتی رہی پھر کرسی سے اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

”مرد تو دروازہ ہے۔ دروازے کا کام رستہ دینا ہوتا ہے یا رستہ روکنا۔ تیرا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ تیرا ہی کیا ہر عورت کا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ اسے لے کر کیا کرے گی تو۔ یہ گل نہیں ہے بی بی! یہ گل نہیں ہے۔ تو گل کی خواہش کیوں نہیں کرتی وجود کی طلب کیوں ہے۔ تجھے ذات کی چاہ کیوں نہیں ہے۔“

ذہن کی دیوار پر کچھ لفظ بار بار ابھر رہے تھے۔ ایک آواز بار بار گونج رہی تھی وہ چپ چاپ گھر آ گئی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے ایک ایک زیوراتا کر پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ کسی جنونی کی طرح وہ سب کچھ اتارتی گئی تھی۔ کائن کا ایک سوٹ پہن کر چہرہ دھو کر وہ واپس واش روم سے کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرے میں ہر طرف چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ گھڑی، ٹیکس، انگوٹھیاں، بریسلیٹ، چوڑیاں، ایئر رنگز وہ خالی نظروں سے ان سب چیزوں کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر صوفے سے ٹیک لگا کر کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی کمرے میں بکھری ہوئی جیولری کو چمکا رہی تھی۔ وہ کسی بت کی طرح ان پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔ وہ نہیں جانتی، کتنی دیر وہ اس طرح بیٹھی رہی تھی۔

روہ رات کے وقت واپس گھر آیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر چونکا تھا۔ وہ صوفے سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔

”تم آج ٹیکسری آئی تھیں؟“ اپنا بریف کیس بیڈ پر اچھال کر وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور بیروں سے سر تک اس کے دراز قد و وجود کو دیکھا تھا۔

”تم تابندہ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟“ اس بار اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ جارحانہ تھا۔

”میں تمہیں اجازت دیتی ہوں سلمان! تم تابندہ سے شادی کر لو۔“

چند لمبے بعد جب وہ بولی تو اس کا جواب سلمان کو حیران کر گیا تھا۔ وہ اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں آ گئی۔ فون کا ریسیور اٹھا کر اس نے اپنے گھر کا نمبر ملانا شروع کیا تھا۔

”اوہ فلک! یہ تم ہو۔ اس وقت کس لئے فون کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟ خاموش کیوں ہو؟“

اس کی ممی نے فون اٹھاتے ہی اس کی آواز پہچان لی تھی۔

”ممی! آپ کبھی تھیں۔ آپ نے مجھے زندگی میں سب کچھ سکھایا ہے۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رکھی۔ آپ جھوٹ بولتی ہیں ممی! آپ نے۔“

مجھے سب سے بڑی۔ سب سے اہم چیز نہیں سکھائی۔“

وہ بول رہی تھی۔ ”کیا ہوا میری جان کیا نہیں سکھایا۔ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟“

”مئی! آپ نے مجھے اللہ سے، اللہ سے محبت کرنا نہیں سکھایا۔ آپ نے، آپ نے مجھے اس کو ڈھونڈنا نہیں سکھایا۔ آپ نے مجھے کنگال کر دیا مئی آپ نے مجھے بھکاری بنادیا۔ ایسا کیوں کیا مئی! ایسا کیوں کیا؟“

وہ اب چیخ رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔ دھائیں مار مار کر رو رہی تھی۔

”آپ نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ مئی! مجھے تو کوئی اٹھانے والا ہی نہیں رہا۔ آپ نے مجھے دنیا میں اکیلا کر دیا۔ مئی آپ نے مجھ پر ظلم کیا۔“

وہ پاگلوں کی طرح چیختی جا رہی تھی۔ گھر کے ملازم لاؤنج میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس کی چیخوں کی آواز سن کر مسلمان بھی لاؤنج میں آ گیا تھا۔ ریسوراب اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ نیم نشی کے عالم میں اب بھی وہی چلا رہی تھی۔

”مجھے اللہ کی محبت نہیں دی۔ مجھے..... مجھے، اس کو ڈھونڈنا نہیں سکھایا مجھے گرا دیا۔ اس کی نظر سے گرا دیا۔“



اس نے بہت آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دی تھیں، کمرے میں اس کے بیڈ کے پاس مئی بیٹھی تھیں اور تھوڑی دور کچھ فاصلے پر ایک آدمی پایا کے پاس کھڑا تھا، وہ اس سے کچھ باتیں کر رہے تھے، اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ذہن ابھی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

”کمرہ..... یہ کون سا کمرہ ہے۔ ہاں یاد آیا، یہ تو میرا کمرہ ہے۔ اپنے گھر میں یعنی میں مسلمان کے گھر میں نہیں ہوں۔“

اس نے آہستہ آہستہ ہر چیز کو پہچاننا شروع کر دیا۔ کسی نے بھی اس کے پاس آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے اعصاب پر ایک عجیب نشہ آور کیفیت سوار تھی۔ تھوڑی دیر بعد پایا اور وہ آدمی اس کے پاس آ گئے تھے پھر اس نے اپنے بازو میں ملکی سی جبین محسوس کی تھی اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”دس پندرہ منٹ تک یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ آہستہ آہستہ نارمل ہو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے اب یہ پہلے کی طرح نہیں چیخیں گی۔“ اس نے اپنے کانوں میں کسی کی آواز سنی تھی۔ شاید اسی آدمی کی۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ غنودگی بڑھتی جا رہی تھی۔ پلکیں اور بوجھل ہو گئی تھیں۔

دوبارہ جب اسے ہوش آیا۔ تب بھی کمرے میں وہی لوگ تھے۔ مئی، پایا اور وہ آدمی مگر اب اسے آنکھیں کھلی رکھنے میں دقت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور کچھ دیر سب کو دیکھنے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ مئی نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر اس آدمی نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

”یہ اب بالکل ٹھیک ہیں اور اگر اٹھ کر بیٹھنا چاہتی ہیں تو انہیں بیٹھنے دیں بلکہ چلنے پھرنے دیں باہر جانے دیں، اس بستر میں قید کرنے کی کوشش نہ کریں انہیں ایسی کوئی تکلیف نہیں ہے کہ جو چلنے پھرنے یا اٹھنے بیٹھنے سے بڑھ جائے۔“

اس آدمی نے مئی سے کہا تھا۔



”کیسی ہیں آپ؟ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“

وہ آدمی اب اس سے مخاطب تھا۔ وہ سپاٹ آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی تھی۔ ایک بار پھر اسے سب کچھ یاد آنا شروع ہو گیا تھا۔

”میرا خیال ہے، انہیں ابھی فی الحال میری مزید ضرورت نہیں ہے۔ آپ تھوڑی دیر بعد ان کی مرضی پوچھ کر انہیں ہکا بھکا کھانا کھلا دیں۔

یہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ میں اب کل صبح انہیں دیکھنے آؤں گا۔“

اس آدمی نے کہا اور پھر وہ ایک بیگ پکڑ کر پاپا کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ مٹی اٹھ کر اس کے پاس بیڈ پر آ گئیں۔ انہوں نے اسے گلے سے

لگا کر اس کا ہاتھ چومنا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے، تمہیں ہوش آ گیا ہے۔“

”اب اس ہوش کا کیا فائدہ؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ مٹی اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

”مجھے کیا ہوا تھا؟“ اس نے ان سے پوچھا تھا۔

”تمہارا تروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے تمہیں ہسپتال میں رکھا تھا پھر گھر لے آئے۔ تمہیں جب بھی ہوش آتا تھا۔ تم چلانے لگتی

تھیں۔ تمہیں مسلسل ٹریکولائزرز پر رکھا ہوا تھا۔ کیا ہوا ہے فلک؟ ایسی کون سی بات ہو گئی تھی جسے تم نے اپنے اعصاب پر اس طرح سوار کر لیا۔ کیا مسلمان سے کوئی جھگڑا ہوا تھا؟“ وہ اب دھیمی آواز میں اس سے پوچھ رہی تھیں۔

”نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے باہر لے جائیں۔ باہر لان میں، میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں۔“

وہ ایک دم بیڈ سے اٹھنے لگی تھی۔ اس کی مٹی نے اس کا بازو تھام لیا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی وہ چکرائی تھی۔ مٹی نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا۔ چند

منٹوں بعد اس نے ایک بار پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی اس بار وہ اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئی۔ مٹی کے ساتھ چلتے ہوئے وہ باہر لان

میں آ گئی۔ مٹی نے اسے لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اندر جا کر اس کے لیے کچھ پھل اور جوس لے آئیں۔ اس نے جوس

کا گلاس خود ہی اٹھا کر پی لیا تھا پھر وہ سیب کی قاشیں کھاتی رہی۔

اب اندر چلیں؟

مٹی نے کچھ دیر بعد اس سے پوچھا تھا۔ شام کے سائے بڑھ رہے تھے۔

”نہیں، ابھی مجھے بیٹھنا ہے۔“

وہ اسی طرح کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ موسم اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ وہ پہلے جیسی فلک نہیں لگ

رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی۔ دو دھیا رنگت زردی مائل ہو گئی تھی۔ وہ کسی بت کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر سامنے

دیوار پر چڑھی ہوئی بوگن ویلیا کی تیل کود دیکھ رہی تھی۔

”مئی!“ اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی تھی۔ میمونہ چونک گئیں اس نے ایک بار پھر انہیں پکارا۔

”مئی! یہ مرد عورت کے لیے کیا ہوتا ہے؟“ میمونہ اس کے سوال کو سمجھ نہیں پاتی تھیں۔ وہ ابھی بھی بوگن ویلیا کو گھور رہی تھی۔

”پتا ہے مئی! مرد عورت کے لیے کیا ہوتا ہے۔ دروازہ ہوتا ہے دروازے کا کام رستہ روکنا ہوتا ہے یا رستہ دینا اور مئی اس دروازے نے میرا راستہ روک لیا ہے۔ میرا ہی نہیں ہر عورت کا رستہ روک لیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ آج تک آگے جانے نہیں دیا۔ اسی لیے تو عورت جینمیر ہوتی ہے نہ ولی۔ وہ دروازہ کھولنے کی کوشش ہی نہیں کرتی، وہیں اسی دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھی رہتی ہے۔ اسے ہی چومتی رہتی ہے سجدہ کرتی رہتی ہے۔ دروازہ پھر رستہ کیوں نہ روکے۔“

وہ اب بوگن ویلیا کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی اور اس کی باتیں میمونہ کو باہر سے اندر تک بلارہی تھیں۔

”فلک! کیا کہہ رہی ہوتی۔ کیوں اس طرح کی باتیں کر رہی ہو؟“

”پتا ہے مئی! عورت نیل کی طرح ہوتی ہے اور مرد دیوار کی طرح۔ نیل ساری عمر دیوار کو ڈھونڈتی رہتی ہے جس کے سہارے وہ اوپر جا سکے نظروں میں آ سکے جہاں تک دیوار جاتی ہے۔ وہ بھی بس وہیں تک جاتی ہے۔ نیل کو لگتا ہے دیوار نہ ہوتی تو وہ زمین پر لپکتی رہتی لوگوں کے پیروں تلے آتی، مگر ان کی نظروں میں نہیں آتی۔ وہ ساری عمر دیوار کی مشکور رہتی ہے۔ اسے سایہ دیتی ہے۔ اپنے پھولوں سے سجاتی ہے، مہرکاتی ہے، جب سوکھنے لگتی ہے تو بھی ساتھ ہی چپکی رہتی ہے۔ کسی چھپکلی کی طرح۔ ختم ہونے کے بعد بھی اسے دیوار کے علاوہ کسی دوسرے کا سہارا نہیں چاہئے اور دیوار..... مئی! دیکھیں دیوار کا کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ اس کا وجود نیل ڈھک دیتی ہے۔ اس کے سامنے ایک آڑ بنا دیتی ہے ہر چیز سے اسے محفوظ کر دیتی ہے۔ اسے سایہ دیتی ہے۔ رونق دیتی ہے پھولوں سے سجاتی ہے مہرکاتی ہے اور خود ختم ہونے تک اس کی احسان مند رہتی ہے اور دیوار وہ تو بس سہارا دینے کا فائدہ اٹھاتی ہے بس سہارا دینے کا اور ساری عمر..... مئی! دیکھیں ساری عمر جب تک نیل ختم نہیں ہو جاتی۔“

”فلک! تم اندر چلو۔“

”پھر جب وہ مرد اسے مل جاتا ہے تو اسے لگتا ہے۔ اسے پوری دنیا مل گئی ہے۔ ہر چیز جیسے اپنے ٹھکانے پر آ گئی ہے۔ سب کچھ جیسے مکمل ہو گیا ہے۔ اس کے لیے وہ مرد بس وہ مرد سب کچھ ہوتا ہے۔ ان داتا، مالک، آقا سب کچھ۔ اسے لگتا ہے زندگی میں اب اسے جو کچھ ملنا ہے۔ اسی کے طفیل ملنا ہے۔ اسی کے سہارے ملنا ہے۔ اسی سے ملنا ہے۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد اس کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ وہ دن کو رات کہے تو وہ رات کہتی ہے، وہ آگ کو پانی کہے تو وہ پانی کہتی ہے۔ اسے لگتا ہے دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے حکم سے ہوتا ہے اس کے وجود کی وجہ سے ہوتا ہے اللہ اس کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ بس وہ مرد ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ آنکھ، کان، ناک، منہ، حیر، ہاتھ، دل، دماغ سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ اسے لگتا ہے، رزق اللہ نے نہیں دینا اس مرد نے دینا ہے اور پھر..... پھر جب وہ مرد اسے چھوڑ دیتا ہے۔ ٹھوکر مار دیتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ دنیا میں کچھ رہا ہی نہیں۔ بس دنیا اس ایک مرد کی وجہ سے ہی تو قائم تھی۔ وہ نہیں تو دنیا نہیں یوں جیسے سارا نظام ہی ختم ہو گیا ہو۔ اسے اللہ یاد نہیں آتا۔ اسے یاد ہی نہیں آتا کہ اللہ نے اسے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے..... مرد کی عبادت کے لیے نہیں، اپنی چاہ کے لیے پیدا کیا ہے۔ مرد کی چاہ کے لیے نہیں اور



عورت تو عورت تو..... ایک مرد کے لیے مرثی ہے۔ اسے مرد سے آگے تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اللہ چھوڑ دے اسے پرواہ نہیں مگر وہ ایک مرد چھوڑ دے تو وہ مر جاتی ہے۔ اللہ اس سے محبت نہ کرے تو اسے فکر نہیں مگر وہ مرد محبت کرنا چھوڑ دے تو اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ ناراض ہو جائے تو اسے دھیان نہیں آتا مگر مرد ناراض ہو جائے تو وہ سولی پر لٹک جاتی ہے۔ مرد کو مرنے کے لیے وہ دو جہاں ایک کر دیتی ہے اور اللہ کو مرنے کے لیے وہ ایک مرد نہیں چھوڑ سکتی۔ مرد کو مرنے کے لیے وہ ہر رشتہ چھوڑنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ ماں کا، باپ کا، بہن کا، بھائی کا۔ ہر ایک کا اور اللہ کے لیے۔“

”فلک! اب بس چپ ہو جاؤ۔ کچھ نہ کہو۔ اس طرح کی باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں تم نے۔“ میمونہ اب روہانی ہو گئی تھیں۔

”ممی! میں نے اس سے کہا میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ ہر چیز سے زیادہ محبت۔ اس نے کہا مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اگر میں اللہ سے یہ کہتی تو کیا وہ بھی یہی جواب دیتا۔ میں نے اس سے کہا میں نے کون سی غلطی کی ہے؟“ اس نے کہا ”میں نہیں جانتا۔“ میں اللہ سے یہ پوچھتی تو کیا وہ میرے سوال کا جواب نہ دیتا؟ میں نے اس سے کہا میں نے تمہارے لیے پچھلے تین سال میں کیا نہیں کیا اس نے کہا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں، اگر میں اللہ کے لیے کچھ کرتی تو کیا اللہ کو بھی پرواہ نہ ہوتی؟ میں نے اس سے کہا۔ میں نے پچھلے تین سال ویسے زندگی گزاری ہے جیسی تم چاہتے تھے۔ اس نے کہا میں کیا کروں۔ میں تین سال اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتی تو کیا اللہ یہ کہتا؟ میں نے اس سے کہا تم مجھے بتاؤ میں کیا کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔ مجھ سے محبت کرنے لگو۔ اس نے کہا مجھے تمہاری ضرورت ہی نہیں ہے۔ مجھے تمہاری کوئی بات، کوئی چیز خوش نہیں کر سکتی۔ میں اللہ سے یہ کہتی تو کیا وہ بھی یہی کہتا؟ ممی! اللہ اور انسان میں یہی فرق ہے۔ اللہ ٹھوکر نہیں مارتا انسان بس ٹھوکر ہی مارتا ہے۔

مرد کو خوش کرنے کے لیے کیا کیا کرتی ہے عورت۔ اندر بدل دیتی ہے، باہر بدل دیتی ہے۔ دل بدل دیتی ہے وجود بدل دیتی ہے، صرف اس لیے کہ وہ خوش رہے۔ ناراض نہ ہو، اس کی نظر نہ بدلے۔ اللہ کو خوش کرنے کے لیے وہ باطن کیا ظاہر ہو کہ بدلے پر تیار نہیں ہوتی۔ اللہ کہتا ہے۔ سر کو ڈھانپ لو۔ مرد کہتا ہے سر کو مت ڈھانپو۔ میری بیوی کو ماڈرن ہونا چاہئے۔ وہ اللہ کی نہیں سنتی۔ مرد کی سنتی ہے۔ اللہ کہتا ہے اپنے وجود کو ڈھانپو، اپنی زیستوں کو چھپاؤ، مرد کہتا ہے ایسا مت کرو تا کہ میرے ساتھ چلتی پھرتی اچھی لگو۔ وہ اللہ کی نہیں مانتی مرد کی مانتی ہے، وہ کہتی ہے مرد کے ساتھ رہنا ہے۔ ساری عمر بسر کرنی ہے، اس کی نہیں مانیں گے تو کس کی مانیں گے۔ مرد کی بیوی ہے، یہ رشتہ تو کبھی بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اللہ کی تو مخلوق ہے یہ رشتہ تو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ وہ دائمی رشتہ کی فکر نہیں کرتی۔ ساری عمر عارضی رشتوں کو روٹی رہتی ہے۔ ان کی فکر کرتی ہے اللہ نے تو عورت کو غلام نہیں بنایا۔ مجبور نہیں بنایا۔ مخلوق نہیں بنایا اس نے خود بنایا ہے، اپنا محور ”ذات“ کو نہیں ”وجود“ کو بنالیا ہے۔“

میمونہ نے اس کے گالوں پر آنسوؤں کو بہتے دیکھا تھا۔

”فلک! فلک! امت روؤ میری جان۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں پھر تم۔“

”ممی! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں بس رونا چاہتی ہوں۔ آپ نے کبھی کیکڑے کو دیکھا ہے؟ ممی! مجھے اپنا وجود ایک کیکڑا لگتا ہے۔ محتاج، بے کس، مجبور۔“

اس نے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا مچیس سال۔ پورے چھ مچیس سال میں اللہ کے بغیر کیسے رہتی رہی ہوں۔

چھبیس سال اللہ مجھے کیسے برداشت کرتا رہا ہے۔ میرے غروں، میرے فخر، میری انا، میری خود پرستی۔ مہی! کیسے.....؟ آخر کیسے وہ یہ سب نظر انداز کرتا ہے۔ جن سے وہ محبت کرتا ہے۔ ان پر آزمائشیں ڈالتا ہے۔ چھبیس سال تک اسے میرا خیال ہی نہیں آیا۔ سب کچھ دیتا رہا بغیر مانگے بغیر چاہے، کسی مصیبت، کسی تکلیف، کسی تنگی، کسی آزمائش کے بغیر یعنی چھبیس سال تک میں اللہ کی محبت کے بغیر جیتی رہی اور آپ آپ سب مجھ پر رشک کرتے رہے۔ میرے مقدر پر۔“

وہ گھٹنوں کے بل چہرے کو ہاتھوں میں چھپائے لان میں بیٹھ گئی تھی۔ ایک بار پھر وہ اسی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”میں انسانوں کی محبت پر شاکر رہی۔ بس انسانوں کی محبت پر..... مجھے اللہ کا خیال ہی نہیں آیا۔ آپ نے ظلم کیا مجھ پر مہی! آپ نے ظلم کیا۔“ میمونہ گم صم اسے بلکتے ہوئے دیکھتی جا رہی تھیں۔ ان کا وجود کسی گلیشیر کی طرح سرد ہوتا جا رہا تھا۔



مسلمان کی تابندہ کے ساتھ شادی دونوں خاندانوں کے لیے دھماکے سے کم نہ تھی۔ فلک کی ذہنی کیفیت کی وجہ اب سب کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ چند ہفتے فلک کی خیریت دریافت کرنے آتا رہا اور پھر ایک دم اس نے آنا چھوڑ دیا تھا پھر فلک کے والدین کو اس کی دوسری شادی کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ مسلمان کے پاس گئے تھے اور انہوں نے اسے بے نقط سنا کی تھیں۔

”میں نے فلک سے دوسری شادی کی اجازت لی ہے۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔“

وہ بے حد مطمئن تھا۔ میمونہ اور شیر انگن جلے بھنے گھر واپس آ گئے تھے۔

”تم نے اسے دوسری شادی کی اجازت کیوں دی؟ تمہیں یہ سب کچھ ہمیں بتانا چاہئے تھا۔ میں دیکھا وہ کیسے اس عورت سے شادی کرتا ہے۔ میں ان دونوں کو گولی نہ مروا دیتا تو پھر کہتیں تم۔ مگر تم نے اجازت کیوں دی؟“

شیر انگن گھر آ کر اس پر بگڑنے لگے تھے۔ وہ اس خبر پر بالکل ناراض تھی یوں جیسے کچھ ہولناکی نہیں تھا۔

”مجھے کیا فرق پڑتا ہے یا پاپا وہ جس سے چاہے شادی کرے میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔“ اس کا انداز شیر انگن کو تپا گیا تھا۔

”تم پاگل ہو گئی ہو۔ کیا دنیا میں نہیں رہتی ہو؟“

”میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ مجھے کوئی بچھتاوا نہیں ہے مجھے فرق نہیں پڑتا اس کی دوسری شادی سے، اس کی زندگی میں ایک اور عورت آ گئی تو کیا۔“

وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ جو ملگجے پڑوں میں ہمیشہ کی طرح کمرہ بند کئے بیٹھی تھی۔

رشنا کو جب اس کے بارے میں پتا چلا تھا تو وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ فلک کو دیکھ کر اسے شاک لگا تھا وہ جیسے ایک پر چھائیں بن کر رہ گئی تھی۔

”کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا فلک؟ اس طرح تو مر جاؤ گی۔“ وہ اس کے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارنے لگی تھی۔

”نہیں مروں گی رشنا! میں نہیں مروں گی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ مسلمان..... اس طرح کر سکتا ہے۔ وہ تو تم سے بہت محبت کرتا تھا پھر اسے کیا ہو گیا۔“ وہ اس کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔



”اس کا قصور نہیں ہے رشنا! اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو وہی دیکھ رہا ہے جو اللہ اسے دکھا رہا ہے۔ وہی کر رہا ہے جو اللہ کروانا چاہتا ہے۔ مجھے اپنے حسن، اپنے وجود پر بڑا غرور تھا نا..... اللہ نے مجھے میری اوقات دکھائی ہے۔“

رشنا نے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

”جانتی ہو رشنا! میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں نے سوچا تھا سلمان کو مجھ سے چھیننے والی مجھ سے بڑھ کر نہیں تو میرے برابر ضرور ہوگی۔ میں یہی سوچ کر اسے دیکھنے گئی تھی فیکٹری، میں نے سوچا تھا اس سے کہوں گی سلمان کے بدلے جتنا روپیہ چاہے لے لے اور اگر وہ میری بات نہ مانتی تو میں اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیتی۔ میں نے اسے بلوایا تھا۔ وہ کمرے میں آئی اور میں نے اسے دیکھا۔ جانتی ہو، رشنا وہ کیسی تھی، ایک مونے اور بھدے جسم والی۔ سیاہ رنگت والی عورت۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے ٹیڑھے میڑھے دانت اس کے چہرے کو اور بھی بد صورت کر رہے تھے۔ اس نے اپنے چہرے کو میک اپ کی دکان بنایا ہوا تھا، کوئی بھی مرد اسے دیکھ کر جان سکتا تھا کہ وہ کس کردار کی عورت ہے مگر سلمان کو اس کے چہرے پر کچھ اور نظر آ رہا تھا۔ میں پتھر کی ہو گئی تھی اسے دیکھ کر جان گئی تھی۔ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ساری بات نظر کی ہوتی ہے اور اللہ نے مجھ سے وہ جھین لی تھی۔ مجھے لگا تھا کسی نے پوری دنیا کی گندگی میرے وجود پر اچھال دی تھی۔ مجھے کسی سے کئی شکوہ نہیں رہا تھا نہ سلمان سے نہ تائبہ سے۔ میں جان گئی تھی۔ اللہ کن کہتا ہے تو چیزیں کیسے ہو جاتی ہیں۔ مجھے پتا چل گیا تھا اللہ دل کیسے پھیر دیتا ہے۔ وہ تو عورت تھی۔ بد صورت سہی مگر عورت تھی۔ اللہ چاہتا تو زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کے لیے سلمان کے دل میں وہ عشق ڈال دیتا جو اس کے دل میں میرے لیے تھا۔ اللہ نے بتایا ہے مجھے چھبیس سال تم میرے بغیر رہ سکتی ہو اپنے آقا، اپنے مالک، اپنے معبود کے بغیر تو پھر اس شخص کے بغیر بھی رہ سکتی ہو۔ اگر اللہ کی محبت کے بغیر جی سکتی ہو تو کسی بھی شخص کی محبت کے بغیر جی سکتی ہو۔ مٹی پاپا سمجھتے ہیں میرے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ سلمان کی بے وفائی کی وجہ سے..... مجھے سایہ کازسٹ کے پاس لے کر پھرتے ہیں۔ چھبیس سال اللہ کا نام نہیں لیا تو کس کو خیال نہیں آیا کہ میں ایسا مل ہوں۔ اب چند ماہ سے اللہ کا نام لے رہی ہوں تو ہر ایک کو میں پاگل کیوں لگنے لگی ہوں۔ تم بتاؤ کیا میں پاگل ہوں؟“

رشنا نے سر جھکا لیا۔ فلک کے چہرے پر ایک پھکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس نے رشنا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ دوبارہ نہیں بولی۔



وہ دریا کے کنارے پر وہیں آ گئی تھی۔ جہاں اس نے اس فقیر کو دیکھا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کے دل پر جیسے ایک گھونسا پڑا تھا۔ پتا نہیں اسے کیوں آس تھی کہ وہ وہاں ہوگا۔ اس کے انتظار میں، اسے کچھ بتانے، اس کے اعصاب پر ایک عجیب سی حتمکن سوار ہو گئی تھی۔ وہ گڑھا ابھی بھی وہیں تھا اس کی طرح پانی اور کچھڑے بھرا ہوا۔ وہ اس کے پاس آ کر ریت پر بیٹھ گئی تھی۔

”یہاں کیوں بیٹھ گئی ہو فلک؟ اٹھ جاؤ۔“ میمونہ نے اسے بیٹھتے دیکھ کر کہا تھا۔

وہ گڑھے کو گھور رہی تھی پھر اس نے اپنا ہاتھ گڑھے میں ڈال کر کچھ کچھ بھرا پانی ہاتھ میں لیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا اس دن وہ فقیر کس طرح کچھڑے اپنے چہرے اور بالوں پر ملنے لگا تھا۔

”دیکھو۔ میں تو کچھڑے سے نہیں ڈرتا، میں تو گندگی سے خوف نہیں کھاتا جانتا ہوں اس کی نظر اس کچھڑ اور گندگی پر نہیں جائے گی وہ صرف

میرے وجود کو دیکھے گا۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے کچھ بھرا ہاتھ اپنے چہرے پر ملنا شروع کر دیا۔ میمونہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھیں۔  
 ”کیا کر رہی ہو تم فلک؟“ وہ جو اس باختہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے پرس سے ٹشو نکال کر اس کا چہرہ صاف کرنا چاہا تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔  
 ”رہنے دیں می! کچھ دیر تو اس کچھڑ سے میرے چہرے کو سجا رہے دیں۔“ اس نے گھٹنوں میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔

”میں جس کی نظر میں ہوں۔ میرے لیے کافی ہے۔ مجھے جس کی محبت چاہئے مل چکی ہے۔ مجھے اور کسی کی محبت کی ضرورت نہیں ہے۔“  
 اسے یاد تھا۔ اس دن یہاں اس نے یہی کیا تھا۔

”تجھے وجود کی طلب کیوں ہے؟“ ذات کی چاہ کیوں نہیں ہے؟“ کوئی آواز ایک بار پھر لہرائی تھی۔

”اب مجھے ذات کی چاہ ہے تو ذات کیوں نہیں ملتی۔“ اس نے اپنے کچھڑ مہرے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ اب اسے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔ اس روز اسے بھکاری کے وجود سے گھن آئی تھی۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ کب کچھڑ کچھڑ نہیں لگتی۔ گندگی گندگی نہیں رہتی وجود کی طلب کیسے ختم ہو جاتی ہے۔  
 ”ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے۔ ہر ایک خود کو مالک سمجھتا ہے۔ جب تک ٹھوکر نہیں لگتی۔ جب تک گھٹنوں کے بل نہیں گرتا۔ اپنی اوقات کا پتہ ہی نہیں چلتا۔“

”فلک پھر رونے لگی ہو۔ چلو گھر چلیں۔ میرا خیال تھا تم یہاں آ کر ریلیکس ہو جاؤ گی۔ خوش ہو گی مگر تم یہاں آ کر بھی..... چلو گھر چلیں۔“  
 میمونہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھالیا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے ان کے ساتھ چلنے لگی۔ مڑک پرچہ ہنسنے سے پہلے اس نے ایک بار  
 پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔





اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھیں۔ کوئی سائیکالٹرسٹ اسے نارمل نہیں کر سکا تھا۔ وہ سارا دن جہاں بیٹھتی بیٹھی رہتی جب اذان کی آواز آتی تو کسی معمول کی طرح اٹھ کر نماز پڑھنے لگتی۔ میمونہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتیں، اور اس کی باتیں پھر اسی ایک محور ایک مرکز کے گرد گھومنے لگتیں۔ اللہ، خدا، رب، مالک، آقا، معبود، میمونہ کو لگتا وہ جب تک ایسی باتیں نہیں چھوڑے گی تب تک نارمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے سلوٹوں سے بھرے ہوئے کپڑے اور جیولری اور میک اپ سے خالی چہرہ انہیں وحشت میں مبتلا کر دیتا۔ انہیں وہ پہلے والی فلک یاد آ جاتی جس کی ایک ایک چیز نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ اسے بیوٹی پارلر لے جانے کی کوشش کرتیں تو وہ چلانے لگتی۔ وہ اسے کسی فنکشن میں لے جانا چاہتیں تو وہ کمرہ بند کر لیتی۔

”اس طرح کمرے میں بند رہ کر تم مر جاؤ گی فلک! خود کو اس طرح تباہ نہ کرو کہیں آیا جایا کرو کہیں باہر چلو۔“

انہوں نے ایک دن اس سے کہا تھا۔ وہ خالی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”باہر جانے سے کیا ہو گا می؟ کیا مل جائے گا باہر؟“ کچھ دیر بعد اس نے تھکے تھکے انداز میں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا تھا۔

”اندر رہ کر اس طرح گھر میں بند ہو کر کیا مل رہا ہے تمہیں؟“

اس کی امی آج بحث کے موڑ میں تھیں۔

”ہاں، کچھ نہیں مل رہا اندر رہ کر بھی مگر باہر جا کر لوگوں کو دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ میں کہیں چھپ جانا چاہتی ہوں می! اس طرح کہ دو باہر

کسی کو نظر آؤ نہ کوئی مجھے دیکھ سکے۔“

اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ میمونہ ہول کر رہ گئی تھیں۔

”سلمان کو بھول جاؤ، دفع کر دو اسے۔ اس کے لیے کیا جوگ لے لو گی۔“ انہوں نے جیسے اسے بہلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تہتہ لگا کر

ہنس پڑی۔

”سلمان! سلمان کو کون یاد کرتا ہے می! اس کے لیے کون جوگ لیتا ہے۔ وہ تو انسان ہے انسانوں کے لیے کون جوگ لیتا ہے۔ جوگ تو بس۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی تھی۔

”تم صبر کیوں نہیں کر لیتیں فلک! سب کچھ بھول کیوں جاتیں؟“ وہ ایک ناک کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”آپ کو کیا پتا می! ہر چیز پر صبر نہیں آتا ہر نقصان صبر کرنے والا نہیں ہوتا۔ آپ کو کیا پتا میرے پاس کیا نہیں رہا۔ میرے پاس ایک تنکا تک

نہ رہے اور لوگوں کو پوری دنیا مل جائے تو مجھے پرواہ نہیں پر جب سوچتی ہوں کہ لوگوں کو می لوگوں کو، اللہ مل رہا ہے تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ صبر آ ہی نہیں سکتا

اور میرے علاوہ اس وقت سب کے پاس اللہ ہے کوئی محروم ہے تو میں ہوں خالی ہاتھ ہوں تو میں ہوں بد قسمت ہوں تو میں ہوں۔“

وہ ایک بار پھر بچوں کی طرح زار و قطار رو رہی تھی۔ میمونہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ جانتی تھیں اب وہ کئی گھنٹے اسی طرح بلند آواز

سے روتی رہے گی۔ بال بکھرائے، سر پر ہاتھ رکھے، گیلے گالوں، لرزتے وجود، بلند سسکیوں اور آنکھوں میں لہرائی وحشت کے ساتھ وہ فلک کا صرف

سایہ لگ رہی تھی۔ ایک پرانا اور بد صورت سایہ۔

اس دو پہر سائیکل سٹ کے کلینک سے واپسی پر مئی نے گاڑی کا رخ لبرٹی کی طرف موڑ لیا تھا۔ انہیں کچھ ضروری چیزیں خریدنی تھیں۔ پارکنگ میں گاڑی پارک کرنے کے بجائے انہوں نے باہر ہی سڑک کے ایک کنارے پر گاڑی پارک کر دی تھی۔

”نہیں، مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔“ اس نے مئی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

”میں گاڑی میں ہی بیٹھتی ہوں۔ آپ کو جو لینا ہے لے آئیں۔“

مئی گاڑی سے اتر کر چلی گئی تھیں۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سڑک پر چلی ہوئی ٹریفک کو دیکھتی رہی، سڑک پر گاڑی کا ایک جھوم تھا وہ بے تاثر آنکھوں سے کسی روپٹ کی طرح انہیں دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے دس بارہ سال کے چھوٹے سے قد اور دبے پتلے وجود کے ایک بچے کو پھنے پرانے کپڑوں اور ٹوٹی ہوئی چنبل پہنے بازو پر کچھ اخبار لٹکانے اپنی گاڑی کی طرف آتے دیکھا تھا۔ وہ بچہ پاس آ کر ایک اخبار ہاتھ میں پکڑ کر کھڑکی کے شیشے پر دستک دینے لگا۔ اسے کسی اخبار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس طرح راستے میں اخبار لیا کرتی تھی۔ مگر آج بے اختیار اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا تھا۔

”اخبار لے لیں باجی!“ اس بچے کی آواز بھی اس کے وجود ہی کی طرح نحیف تھی، وہ اخبار اس کے سامنے لہرا رہا تھا مگر اس کی نظریں گاڑی کے اندر ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔

فلک کو کوئی عجیب سا احساس ہوا تھا۔ ڈیش بورڈ کے ایک کونے میں اس نے کچھ روپے پڑے دیکھے تھے۔ مئی اکثر اپنی گاڑی میں اوپر تھوڑی بہت رقم اس طرح گلوکپارٹمنٹ اور ڈیش بورڈ کے اوپر ضرور رکھتی تھیں۔ اس نے وہ روپے اٹھا کر اسے بچے کے ہاتھ میں تھما دیئے اس نے کچھ حیرانی سے فلک کو دیکھا تھا یوں جیسے اسے فلک سے یہ توقع نہیں تھی۔

”یہ روپے رکھ لو، مجھے اخبار کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے نرم آواز میں اس بچے کو مخاطب کیا تھا۔

”مگر یہ تو بہت زیادہ ہیں۔“ بچے کی آواز میں کچھ گھبراہٹ تھی۔

”پھر بھی رکھ لو۔“

اس نے روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے تھے۔ اس بچے کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے ایک چمک ابھری تھی پھر وہ سوکانوٹ جیب میں ڈال کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ فلک نے ایک بار پھر گاڑی کا شیشہ اوپر چڑھا لیا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ اس بچے کو دور جاتا دیکھتی رہی۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ نے اس کے پورے وجود کو پسینہ سے شرابور کیا ہوا تھا۔ اسے اس بچے پر ترس آیا تھا، پتا نہیں کون سی مجبوری اسے اس عمر میں یوں خوار کر رہی تھی۔ بچہ بہت دور چلا گیا تھا مگر اس کی نظریں ابھی بھی اس پر مرکوز تھیں پھر اچانک اس نے بچے کو بھاگ کر سڑک کر اس کرنے کی کوشش کرتے دیکھا اور پھر بائیں سمت سے آنے والی گاڑی نے اسے بہت زور سے چند فٹ اوپر اچھال دیا تھا فلک کے حلق سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ وہ اب اسے نظر نہیں آ رہا تھا سڑک پر گزرے والی ٹریفک نے اسے اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اس نے چند گاڑیوں کو اس جگہ رکھتے دیکھا جہاں



وہ گرا تھا، پھر فٹ پاتھ پر چلے والے کچھ لوگ بھی تقریباً بھاگتے ہوئے اس جگہ کی طرف گئے تھے۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔  
 ”کیا بات ہے فلک؟ کہاں جا رہی ہو؟“ ممی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہی تھیں۔

”وہاں ممی! وہاں ایک بچے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“

اس نے ہاتھ اٹھا کر گاڑی کے کھلے دروازے سے دور اس جگہ کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں اب رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ممی اپنی سیٹ سنبھال چکی تھیں۔

”ایسے ایکسیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ تم بھلا وہاں جا کر کیا کرو گی؟“ انہوں نے ڈور ہینڈل کو پکڑ کر اس کی طرف والا دروازہ بند کر دیا تھا۔  
 ”ممی وہ بچہ..... پتا نہیں وہ۔“

آواز اس کے حلق میں انگ گئی تھی۔ ممی نے کار اسٹارٹ کر لی تھی۔

”اتنے لوگ ہیں وہاں، لے جائیں گے اسے ہسپتال۔ ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں وہاں جا کر، اور ویسے بھی مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔ مسز انور کے گھر جانا ہے ان کے بونیک کا افتتاح ہے۔“

وہ بے یقینی سے ممی کے چہرے کو دیکھتی رہی، گاڑی اب سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

”کیا انہیں کچھ محسوس نہیں ہوا؟ کچھ بھی نہیں؟ آخر کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں تھا۔“

ممی اس کی سوچوں سے بے خبر اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ اس نے اپنے اندر خلا کو ایک بار پھر پھیلنے سے محسوس کیا تھا۔ ”یہ بے بسی ہمارے وجود، ہماری کلاس کا حصہ۔ کیوں بن گئی ہے؟ چوٹ کھانے والا اپنا نہ ہو تو کیا اسکی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ میری کلاس میز کی بات کرتی ہے، اپنی کیلنس کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے، کیا انسانی ہمدردی میسرز سے باہر کی کوئی چیز ہے کیا زندگی گزارنے کے لیے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کا طریقہ آنا ہی کافی ہے؟“ سوالات کی ایک بھر مار نے اسے نئے سرے سے گھیر لیا تھا۔

”اور پھر اللہ اتنا دور لگتا ہے تو ہمیں اس بات کا شکوہ کرنے کا کیا حق ہے۔“

اس نے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی مسلسل بول رہی تھیں۔ اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اس بچے کا چہرہ آ گیا تھا۔ گاڑی کے ساتھ نکلنے کے بعد اچھلتا ہوا اس کا وجود اور ہوا میں لہراتے ہوئے اخبارات اس نے اپنے وجود کو ریت کا ڈھیر بننے محسوس کیا تھا۔

”ممی! چپ ہو جائیں۔ فار گاڈ سیک چپ ہو جائیں۔ بند کر دیں یہ ساری باتیں میرا دم گھٹ رہا ہے، بس خاموش ہو جائیں۔ یہ سب کچھ مجھے نہ بتائیں۔“

وہ پاگلوں کی طرح کانوں پر ہاتھ رکھ کر یک دم چیخنے لگی تھی۔ میمونہ کچھ خوفزدہ ہو کر خاموش ہو گئی تھیں۔

”ابھی تو سائیکل اسٹ کے ساتھ سیشن کروا کر لائی ہوں اور پھر بھی آدھ گھنٹہ بعد ہی اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔“ میمونہ نے مایوسی سے سوچا تھا۔

اگلے کئی دن تک وہ گم صم اپنے کمرے میں قید رہی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اس بچے کو اپنے ذہن سے محو نہیں کر سکی تھی۔ وہ جیسے اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ ”پتا نہیں اسے کتنی چوٹ آئی تھی پتا نہیں وہ زندہ بھی ہو گیا۔“

وہ آگے کچھ نہ سوچ پاتی۔ اس دن عصر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی کھڑکیوں کے پاس رکھی ایزی چیئر کے اوپر آ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے باہر لان میں مدھم آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے آواز کو پہچاننے کی کوشش کی تھی پھر اس نے الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ آواز اس کے ڈرائیور کی بیٹی رضیہ کی تھی۔ جو ٹو نے پھوٹے تلفظ کے ساتھ انگلش کا کوئی سبق دہرا رہی تھی۔

”ابو بن ادھم ایک عابد و پرہیزگار شخص تھے۔ ایک رات کو اچانک ان کی آنکھ کھل گئی۔ ان کا کمرہ نور سے روشن تھا۔ انہوں نے ایک فرشتے کو دیکھا جو اپنی سنہری کتاب میں کچھ لکھ رہا تھا۔“

بہت آہستگی سے فلک نے اپنی بند آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی سماعتیں اب کھڑکی کے باہر گونجنے والی آواز پر مرکوز تھیں۔ رضیہ تقریباً ہر لفظ کو بہت برے طریقے سے ادا کر رہی تھی مگر وہ پھر بھی لفظوں کو پہچان رہی تھی۔

”ابو بن ادھم نے فرشتے سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے تو اس نے کہا کہ ان لوگوں کے نام لکھ رہا ہوں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں۔“ فلک اب سانس تک روک چکی تھی۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ رضیہ اب لڑکھڑاتی آواز کے ساتھ رک رک کر بول رہی تھی۔

”ابو بن ادھم نے پوچھا کیا اس فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہے؟ فرشتے نے نفی میں جواب دیا تو ابو بن ادھم نے درخواست کی کہ ان کا نام ان لوگوں میں شامل کر لیا جائے جو اپنے ساتھی انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔“

فلک کو اپنی آنکھوں میں کچھ کرچیاں سی چھٹی محسوس ہوئی تھیں۔

”فرشتے نے ابو بن ادھم کا نام لکھا اور غائب ہو گیا، اگلی رات فرشتہ پھر آیا اور اس نے ابو بن ادھم کو ان لوگوں کی لسٹ دکھائی جن سے اللہ محبت کرتا ہے۔“

ابو بن ادھم کا نام اس لسٹ میں سب سے اوپر جگہ گار ہا تھا۔

رضیہ ایک بار پھر اپنے سبق کو شروع سے پڑھنے میں مصروف تھی اور فلک اندر کسی پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ گالوں پر پھسلتا ہوا گرم پانی اس کی گود میں رکھے ہوئے ہاتھوں پر گر رہا تھا۔

”اور میں تم تک کسی انسان کے لیے کچھ کیے بغیر ہی پہنچنا چاہتی تھی پھر تم رستہ کیسے دکھاتے؟ اور اب اگر میں لوگوں کے ذریعے تم تک آؤں تو کیا تم مجھے مل جاؤ گے؟ کیسے لوگ ہوتے ہیں، اللہ جن سے تو محبت کرتا ہے، جنہیں تو چاہتا ہے، جنہیں تو مل جاتا ہے؟ کیا ابو بن ادھم جیسے لوگ؟ اور ان کی طرح کیسے بنا جاتا ہے؟ اللہ تو تان میں کیا خاص چیز ہوتی ہے؟“

اس کا ذہن جیسے کسی گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔





”باجی ایہ گھر ہے اس کا۔“ بالآخر ایک گھر کے سامنے پہنچ کر وہ لڑکا رک ہی گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک جھگی کے دروازے پر دستک دی تھی۔ فلک طائرانہ نظروں سے اس خستہ حال جھگی کا جائزہ لیتی رہی۔ چند لمحوں بعد سترہ اٹھارہ سال کی ایک لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔

”یہ باجی ماجد سے ملنا چاہتی ہیں۔“ اس کے ساتھ آنے والے بچے نے جیسے اس کا تعارف کروایا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر تعجب اور سراسیمگی اکٹھی ابھری تھی، وہ بچہ چلا گیا تھا۔

”تم ماجد کی بہن ہو؟“ فلک نے اس سے پوچھا۔

”ہاں!“ اس لڑکی کا جواب مختصر تھا۔

”میں اندر آ جاؤں؟“ فلک نے اس سے اجازت طلب کی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

فلک دروازہ پار کر کے اندر آ گئی تھی۔ جھگی کی ہر چیز اپنے مکینوں کی خستہ حالی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اندر عجیب سی گھٹن اور جس تھا یوں جیسے وہاں ہوا کا گزر کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ فلک کو بے اختیار اپنا چھ کنال کا گھریا دیا تھا۔ اس کا ہاتھ روم بھی اس کمرے سے زیادہ بڑا تھا۔ لڑکی کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کہاں بٹھائے۔ سادہ لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود وہ اپنے چہرے اور حلیے سے اسے کوئی معمولی عورت نہیں لگتی تھی۔ اس نے کچھ بولکھلا ہٹ کے بعد ایک جھلکا سی چارپائی اس کے سامنے بچھا دی تھی، فلک چارپائی پر بیٹھنے کے بجائے مٹی سے لیے ہوئے فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ لڑکی جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔ پھر کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ خود بھی فلک کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گئی تھی۔

”تم ہماری امی کہاں ہیں؟“ اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھا تھا۔

”وہ کچھ گھروں میں کام کرتی ہیں، وہاں گئی ہوئی ہیں۔“

”اور ابو؟“

”انہیں مرے دو سال ہو گئے ہیں۔“

فلک ایک لمحوں کو چپ ہو گئی تھی۔ ”کتنے بہن بھائی ہو؟“

”تین بہنیں اور دو بھائی۔“ اس نے لڑکی کے چہرے پر ایک سائے کو گزرتے دیکھا تھا۔

”ماجد کے مرنے کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ دوسرا بھائی کیا اس سے بڑا ہے؟“

”نہیں، وہ سات سال کا ہے۔“

”تم سب سے بڑی ہو؟“

”ہاں، باقی دو اماں کے ساتھ لوگوں کے گھر کام کرنے جاتی ہیں۔ میں گھر پر ہوتی ہوں۔ کپڑے سیتی ہوں لفافے بناتی ہوں اور بھی بہت سے کام کرتی ہوں، تمہیں کوئی کام کروانا ہے کیا؟“

فلک گم صم اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی آس تھی۔ یوں جیسے..... فلک نے اپنا بیگ کھولا تھا پھر ایک پیکٹ

نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کچھ روپے ہیں، تم اپنی امی کو دے دینا۔ میں دوبارہ آؤں گی۔ تم لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا وہ لڑکی کو ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے نکل آئی تھی۔“

اس دن وہ اس بچے کے بارے میں پوچھنے کے لیے اسی سڑک پر آئی تھی۔ سڑک پر اخبار بیچنے والے بچوں سے اس نے اس بچے کے بارے میں پوچھا تھا اور یہ جان کر وہ دل گرفتہ سی ہو گئی تھی کہ وہ بچہ مر چکا ہے۔ ”کیا تم مجھے اس کا پتا بتا سکتے ہو؟“ فلک نے ایک بچے سے کہا تھا وہ بچہ کچھ بچکا ہٹ کے بعد اسے اس علاقے میں لے آیا تھا جہاں جھگیوں اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں کا پورا جہاں آباد تھا اور پھر وہ ماجد کے گھر پہنچ گئی تھی۔ اپنے گھر واپس آتے ہوئے اسے پہلی بار اپنے گھر کے در دیوار مانوس نہیں لگ رہے تھے، اسے آدھے گھنٹے پہلے دیکھی ہوئی وہ جھگی یاد آ گئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کسی نے اسے حلق سے دبوچ لیا تھا۔

”لوگ کن کن چیزوں کے بغیر رہ رہے ہیں اور میں۔ مجھے لگتا ہے کہ دنیا میں کسی پر قیامت ٹوٹی ہے تو وہ میں ہی ہوں۔ چھ کنال کے بنگلے میں رہ کر، آٹھ آٹھ لاکھ کی گاڑیوں میں پھر کر، اپنے وجود کو آسانٹوں سے سجا کر اور اپنے پیٹ کو دنیا کی ہر نعمت سے بھر کر آخر مجھے کس اللہ کی تلاش ہے۔ وہ آخر مجھ پر نظر کرے تو کیوں کرے۔ مجھ سے محبت کرے تو کیوں کرے۔ مرد محبت کرے تو حائف کا ذہیر عورت کے سامنے لگا دیتا ہے۔ اس کے لیے بے تحاشا روپیہ خرچ کرتا ہے اسے ہوٹلز میں لے کر جاتا ہے۔ وہ کسی چیز کی طرف اشارہ کرے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ اسے خرید کر نہ دے۔ عورت مرد سے محبت کرتی ہے تو اس مرد کے اشارے پر چلتی ہے۔ وہ اس سے روپیہ مانگے تو وہ سو جھوٹ بول کر ہر قیمت پر اسے روپیہ دیتی ہے۔“

اللہ سے انسان محبت کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اللہ بھی اس سے محبت کرے مگر محبت کے لیے وہ کچھ دینے کو تیار نہیں۔ اللہ کے نام پر وہی چیز دوسروں کو دیتا ہے جسے وہ اچھی طرح استعمال کر چکا ہو یا پھر جس سے اس کا دل بھر چکا ہو۔ چاہے وہ لباس ہو یا جوتا۔ وہ خیرات کرنے والے کے دل سے اتاری ہوئی چیز ہوتی ہے اور اس چیز کے بدلے وہ اللہ کے دل میں اترا نا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اس پرانے لباس، گھسی ہوئی چپل یا ایک پلیٹ چاول کے بدلے اسے جنت میں گھر لے جائے۔ اللہ اس کی دعائیں قبول کرنا شروع کر دے۔ اس کے بگڑے کام سنورنے لگیں۔ وہ جانتا ہے، اللہ کو دلوں تک سرنگ بنانا آتا ہے پھر بھی وہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور میں میں فلک شیر آگن صرف آنسو بہا کر، مصلے پر بیٹھ کر، صرف اللہ کا نام لے لے کر اللہ کی محبت حاصل کرنا چاہتی ہوں اس کی نظر چاہتی ہوں مگر اس کے لیے کرنا کچھ نہیں چاہتی۔“

کوئی اس کے دل کو جیسے مٹھی میں لے رہا تھا۔ لاؤنچ کے اندر جانے کے بجائے وہ باہر دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ سامنے نظر آنے والا وسیع و عریض لان جیسے اسے ہوا لارہا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن کو پکڑ کر دیکھا۔ لباس سادہ تھا مگر قیمتی تھا۔ اسے یاد تھا چند ماہ پہلے اس نے کراچی سے سلمان کے ساتھ گرمیوں کے ملبوسات کی شاپنگ کی تھی تب ابھی وہ واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اسے اس کپڑے کی قیمت یاد نہیں تھی مگر یہ یاد تھا کہ وہ قیمت ہزاروں میں تھی۔



”یہ تو کل ہے؟ یہ قناعت ہے؟ یہ صبر ہے؟ یہ عاجزی ہے؟ اور مجھے چاہئے اللہ۔“

اس کا دل ڈوب گیا تھا۔ قیص کو اس نے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ پاؤں میں پہنے جوتے پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اس نے داہنے پیر کا جوتا اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا آج وہ جس علاقے سے ہو کر آئی تھی۔ وہاں اس نے بہت سی عورتوں اور بچوں کے پیروں میں معمولی سی چپل تک نہیں دیکھی تھی اور یہ اس جوتے کی قیمت بھلا کیا ہوگی؟ اس نے سوچنے کی کوشش کی تھی۔ اسے یاد نہیں آیا۔ وہ ہر بار شاپنگ پر جانے پر دو چار جوتے ضرور لیا کرتی تھی اور مہینے میں چھ سات بار وہ شاپنگ پر چلی جایا کرتی تھی۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ یہ جوتا اس نے کب خریدا تھا مگر وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ اس کا کوئی جوتا بھی ایک ہزار سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے جوتا گر گیا تھا۔ وہیں دیوار کے ساتھ پیشانی ٹیک کر اس نے سسکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا تھا۔ شاید کسی ملازم نے اندر جا کر اس کی می کو اطلاع دی تھی وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔

”فلک! تم واپس آ گئیں؟ کیا ہوا ہے میری جان؟ کیوں اس طرح رو رہی ہو؟“ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔

”ممی! آپ کو پتا ہے مجھے اللہ کیوں نہیں مل سکتا۔ میرے اور اللہ کے درمیان خواہشوں کی دیوار ہے۔ آسائشوں کی دیوار ہے۔ میں نے اپنے ارد گرد دنیا کی اتنی چیزیں اکٹھی کر لی ہیں کہ اللہ تو میرے پاس آ ہی نہیں سکتا ابو بن ادھم کو اس کی محبت کی چاہ تھی۔ اسے اس نے اپنی محبت دے دی۔ میری تمنا یہ چیزیں تھیں۔ آسائش تھیں، سلمان تھا۔ مجھے اس نے بس یہ سب کچھ ہی دیا جسے وہ اپنی محبت دے دیتا ہے اسے پھر اور کسی چیز کی خواہش ہی نہیں ہوتی اور جسے دنیا دیتا ہے اس کی خواہش بھوک بن جاتی ہے۔ کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ ممی ابو بن ادھم جیسے لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں اور میرے جیسے لوگ۔“

وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

”کون ابو بن ادھم؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ممی اب پریشان ہو رہی تھیں۔

”ممی! مجھے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کچھ بھی نہیں جن لوگوں کی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ انہیں سب کچھ مل جاتا ہے۔ میرے جیسے لوگ تو ساری زندگی سمجھنے کی کوشش ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔“

”تمہیں پھر دورہ پڑ گیا ہے پھر وہی جنون سوار ہو گیا ہے۔“ اس کی ممی نے ایک گہری سانس لے کر کہا تھا۔

”یہ جنون نہیں ہے۔ ممی! یہ جنون نہیں ہے۔“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔

”یہ جنون ہے۔“ اس نے زمین پر پڑا ہوا جوتا انہیں دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ ایک عجیب سی وحشت اس پر سوار ہو گئی تھی۔

”یہ جنون ہے۔“ اب وہ اپنی قیص پکڑ کر انہیں دکھا رہی تھی۔

”یہ لاکھوں کی گاڑیاں جنون ہے۔“ اس نے پورچ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”یہ کروڑوں کے گھر جنون ہیں۔ آئیں میں آپ کو دکھاؤں اور کیا کچھ جنون ہے۔“ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی انہیں گھر کے اندر لے گئی۔ ”یہ کار پٹ جنون ہے جن پر چلتے ہوئے ہمیں لوگوں کے پیروں میں جیسے ہوئے پتھر اور کانٹے محسوس نہیں ہوتے۔ یہ عالی شان اور قیمتی فرنیچر جنون ہے جن پر بیٹھ کر ہمیں اپنا وجود بھی اتنا ہی عالی شان اور قیمتی لگنے لگتا ہے۔“

وہ لاؤنج میں آ کر چلانے لگی تھی۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے فلک“ ممی اب گھبرا رہی تھیں۔

”ہاں ممی! میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ میرے اور آپ جیسے سارے لوگ پاگل ہی تو ہوتے ہیں ہم لوگوں نے چیزوں سے اتنا عشق کیا ہے کہ اس دنیا میں رہنے والے انسانوں کی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ ہم سب پاگلوں نے مل کر۔ آئیں میں دکھاؤں مجھے کن چیزوں نے پاگل بنایا ہے۔ وہ ایک بار پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے بیڈروم میں لے آئی۔ روتے ہوئے اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پرفیوم ان کی طرف اچھالنے شروع کر دیئے تھے۔“

”یہ بھی جنون ہے ممی! میرے اور آپ جیسے لوگ اپنے اندر کی بدبو کو چھپانے کے لیے یہ پرفیوم خود پر انڈیلتے ہیں۔ اپنے چہرے اور وجود کو میک اپ سے رنگتے رہتے ہیں۔“ اس نے اب اپنی وارڈروپ کھول کر پڑے باہر پھینکنے شروع کر دیئے تھے۔

”یہ ہے جنون ممی! یہ ابو بن ادم جیسے لوگ لباس سے جسم کو چھپانے کا کام لیتے ہیں۔ ہمارے جیسے لوگ جسم کو دکھانے کا۔ یہ مہنگے کپڑے پہن کر ہمیں جیتھروں میں پھرنے والے لوگ جانور لگتے ہیں۔“ اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔

”یہ جنون ہے ممی۔“ اب اس نے اپنی وارڈروپ کھول کر زیور کمرے میں اچھالنے شروع کر دیئے تھے۔ ”یہ جنون ہے۔ یہاں کتنے لوگ ہیں ممی جو ایک وقت کے کھانے کے لیے صبح سے شام تک جانوروں کی طرح کام کرتے ہیں پھر بھی بہت دفعہ انہیں کچھ کھانے کو نہیں ملتا جو رات کو سوئیں تو انہیں یہ بھی یقین نہیں ہوتا کہ صبح تک جھگی کی ہلتی ہوئی چھت ان کے گھر کو گھر رہنے دے گی۔ یا لمبے کا ڈھیر بنا دے گی۔ ماحد جیسے بچوں کے لیے کوئی بچپن سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ ان کی زندگی بیدار کش سے مرنے تک صرف بڑھا پا ہوتا ہے اور میرے جیسے لوگ روپیہ صرف زندگی کی بنیادی ضروریات پر ہی خرچ نہیں کرتے پھر انہیں اپنے وجود پر زیور بنا کر لٹکا بھی لیتے ہیں۔ جسم کے ہر حصے پر، پاؤں میں انگلیوں میں۔ کلائیوں میں، کانوں میں، ناک میں، گردن میں، ماتھے پر، سر پر، کیا حق پہنچتا ہے ممی! مجھے اور آپ جیسے لوگوں کو یہ ظلم کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ پھر ڈاکے کیوں نہ پڑیں ہم جیسے لوگوں کے گھروں پر دن دھاڑے سڑک پر ہمارا زیور کیوں نہ لوٹا جائے۔“

وہ اب ہلک رہی تھی۔ اس کی می دم خود اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر بیڈروم ریفریجریٹر کھول دیا تھا۔

”یہ چیزیں ہیں ممی! جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ ان چیزوں کو کھانے کے بعد ہمیں روٹی کے سوکھے ٹکڑوں سے پیٹ بھرنے والے کیڑے لگتے ہیں، انسان نہیں۔“

”یہ سب خدا کی رحمت ہے۔ اس کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہے دے ہمیں دیا ہے تو ہمیں اسے خرچ کرنے کا حق ہے، تمہیں شکر کرنا چاہئے کہ خدا نے تمہیں ان سب چیزوں سے محروم نہیں کیا۔“

میمو نہ پہلی بار بلا آخر ہمت کر کے بولی تھیں۔

”ممی! دولت فضل نہیں ہے آزمائش ہے۔ کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا یہ فریج رحمت نہیں ہو سکتا، کیڑوں سے بھری ہوئی یہ وارڈروپ



رحمت نہیں ہو سکتی، چیلری سے بھرے ہوئے یہ دراز اور روپے سے بھرا ہوا یہ لاکر بھی رحمت نہیں۔ یہ گاڑیاں، یہ بنگلے، یہ سب کچھ رحمت نہیں ہے۔ فضل نہیں ہے مہی اصراف ہے، کمینگی ہے، خود غرضی ہے، ذلالت ہے۔ آپ کے اور میرے پاس یہ رحمت اور فضل ہے تو اس گھر کے نوکر ہماری اترن کیوں پہنتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے کوارٹروں میں کیوں رہتے ہیں۔ اس رحمت اور فضل کی حفاظت کے لیے جو گاڑ گیٹ پر کھڑے ہیں۔ وہ ٹوٹی ہوئی سائیکلوں پر کیوں جاتے ہیں۔ اس گھر میں رہنے والے نوکروں کے بچے چیزوں کے لیے کیوں ترستے ہیں، ہم نے اللہ کی رحمت اور فضل میں سے انہیں کیا دیا؟ اپنی اترنیں، بچا ہوا کھانا، جھڑکیاں، تنخواہوں میں سے کٹوتی۔ آپ نے کبھی نوکروں کے بچوں سے پوچھا کہ وہ اسکول کس طرح جاتے ہیں۔ اگر پیدل جاتے ہیں تو آپ نے کبھی اپنی ان دس گاڑیوں میں کسی ایک پر چند گھنٹوں کے لیے انہیں سفر کرنے دیا۔ اگر اسکول نہیں جاتے تو آپ نے کبھی جاننے کی کوشش کی کہ کیوں نہیں جاتے۔ میں سوچتی ہوں، کاش اللہ مجھے کچھ نہ دیتا پھر میں اس سے یہ سب کچھ مانگتی، مانگنے کا ہی سہی مگر اس کے اور میرے درمیان کوئی رشتہ تو ہوتا، چھبیس سال میں ایک باری سہی کبھی میں اس سے کچھ مانگتی تو..... اور پھر وہ مجھے وہ چیز دے دیتا تو میں خوش ہو کر اسے اور یاد کرتی۔ اس کا شکر یہ ادا کرتی اور اگر وہ میری دعا قبول نہ کرتا تو بھی میں شکر کرتی۔ اس کی رضا پر خوش رہتی اور یہ شکر گزاری، یہ صبر اسے کتنا خوش کرتا۔ مہی ایہ لوگ جو ہمیں کیڑے اور جانور لگتے ہیں، یہ خدا کے نزدیک کیا ہیں کاش آپ کو بھی پتا چل جاتا۔“

وہ اب کارپٹ پر گھٹنوں کے بل گرے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپنے وھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میمونہ بے بسی سے اس کے پاس کھڑی تھیں اس عمر میں اکلوتی اولاد کو اس طرح خوار ہوتے بھی دیکھنا تھا۔ انہیں بے اختیار رونا آیا تھا۔



اگلے تین ہفتے وہ ہاسپٹل رہی تھی۔ ایک بار پھر وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس بار بچھلی باری کی نسبت اس کی کیفیت زیادہ خراب تھی۔ جب تک وہ ٹریکولائزرز کے زیر اثر رہتی۔ سب کچھ ٹھیک رہتا۔ مگر جب بھی وہ ہوش میں آتی، چیخنے چلانے لگتی۔ اس کے سر میں درد ہوتا۔ وہ دم گھٹنے کی شکایت کرتی۔ اس کی بھوک پیاس ختم ہو گئی تھی۔ تین ہفتے بعد آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوتی گئی تھی۔ شیراز گلن ڈاکٹر سے مشورہ کے بعد اسے گھر لے آئے تھے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے امریکہ بھجوا دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ ماحول کی تبدیلی اس کی ذہنی حالت کو بہتر کر دے گی۔

اس صبح میمونہ نے اسے کمرے سے کچھ بیگز کے ساتھ نکلنے دیکھا تھا تو وہ ہول گئی تھیں۔ ”کہاں جا رہی ہو فلک؟“

”تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی مہی۔“ وہ آج خلاف معمول بہت پرسکون لگ رہی تھی۔

”مگر جا کہاں رہی ہو اور ان بیگز میں کیا ہے؟“ میمونہ کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”میری چیزیں ہیں، کسی کو دینے جا رہی ہوں۔“

”کس کو دینے جا رہی ہو؟“

”جن کو ضرورت ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں مہی! ان چیزوں کے بغیر کیسے رہا جاتا ہے، کل رات میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ جن کا

دل مومن ہوتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر کچھ بھی دے سکتے ہیں۔ کسی ملال کے بغیر، میں دیکھنا چاہتی ہوں مہی! کیا میرا مومن کا دل ہے۔ کیا اپنی بہترین اور پسندیدہ چیزیں دوسرے کو دینے پر مجھے ملال ہوتا ہے؟“ میمونہ اسے روکنا چاہتا تھا مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ وہ چلی گئی تھی۔

”وہ جو کرتی ہے، اسے کرنے دو۔ اگر یہ سب کرنے سے وہ ٹھیک ہو سکتی ہے تو یہ سب کچھ مہنگا نہیں ہے۔ دے دینے دو جو دینا چاہتی ہے۔“ اس کے جانے کے بعد انہوں نے گھبرا کر شیر انگن کو فون کیا تھا اور انہوں نے اسے یہ جواب دیا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

پھر یہ سب کئی ہفتے ہوتا رہا تھا۔ اس نے اپنی تقریباً تمام چیزیں مختلف اداروں کو عطیہ کر دی تھیں۔ وہ روز صبح گھر سے پیدل نکل جاتی، کبھی ایس او ایس ویلج جا کر پورا دن وہاں بچوں کو پڑھاتی رہتی یا پھر چھوٹے بچوں کو سنبھالتی، کبھی فائونٹین ہاؤس جا کر شیزوفرینیا کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے ویکٹوں میں سفر کرنا سیکھا تھا۔ لوگوں کے جوم میں دھکے کھاتے ہوئے سڑک تے سیٹے ہوئے اپنے لیے جگہ بناتے ہوئے اس نے اس تکلیف کو محسوس کیا تھا، جو اس کے ارد گرد نظر آنے والے عام لوگوں کا مقدر تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے چیزیں خریدنے ان معمولی بازاروں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں جانے لگی تھی پہلے جن کے تصور سے بھی اس کا دم گھٹتا تھا۔ اپنے وجود کو سر سے پاؤں تک ایک سیاہ چادر سے چھپائے وہ لوگوں کے چہرے حسرت سے دیکھتی ہر چہرے کو دیکھ کر اسے یوں لگتا جیسے اللہ اس سے ہی محبت کرتا ہوگا۔

اس دن اپنے گھر کی طرف آتے ہوئے اسے اچانک کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے سڑک پر چلتے ہوئے اچانک پیروں سے چپل اتار کر پیدل گرم سڑک پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ گرم سڑک اور اس پر پڑے ہوئے پتھر اس کے پیروں کے تلوؤں کو کھلانے لگے تھے۔ سڑک پر اکا کا ٹریفک آ رہی تھی۔ وہ گیلی آنکھوں اور چلتے تلوؤں کے ساتھ دور تک چلتی رہی پھر جب تکلیف اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اس نے چپل پیروں میں پہن لی۔

”اور جب حضور ﷺ اپنے صحابیوں رضوان اللہ علیہم کو ہدایت دیتے تھے کہ وہ آسائش کو عادت نہ بنائیں اور کبھی کبھار ننگے پاؤں بھی چلیں تو وہ انہیں اس تکلیف سے مانوس کرنا چاہتے تھے جسے میں برداشت نہیں کر سکی اور جو بہت سے لوگوں کا مقدر ہوتی ہے۔“

اسے اپنے پیروں میں اب بھی جلن محسوس ہو رہی تھی اور اب اسے ان لوگوں کے گندے اور ننگے پیروں سے گھن نہیں آ رہی تھی جو کسی جوتے سے بے نیاز سامان کندھوں پر اٹھائے ادھر ادھر جاتے اسے نظر آتے تو اسے وحشت ہوتی۔ گھر آ کر اس نے الماری میں پڑے ہوئے چند آخری جوتے بھی نکال لیے تھے۔

”ایمنہ! یہ لویہ جوتے تم پہن لینا۔“ وہ جوتے لے کر گھر کے پیچھے سرونٹ کو اڑ گئی تھی اور وہاں اس نے اپنی نوکرانی کے پیروں میں اتنی عقیدت اور عاجزی سے جھک کر وہ جوتے رکھے تھے کہ وہ گھبرا گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی مالک سے کچھ کہتی، وہ وہاں سے آ گئی تھی۔

”بی بی کے دماغ کو واقعی کچھ ہو گیا ہے۔“

ایمنہ نے نئے جوتے اٹھاتے ہوئے ہمدردی سے اپنی مالک کے بارے میں سوچا تھا۔

اس دن وہ اچھرہ بازار میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان پر گئی تھی۔

”مجھے وہ سوٹ دے دیں جو بہت سستا ہو پھر بھی ہر کوئی اس میں نقص نکال کرنا پسند کرتا ہو اور خریدنے سے انکار کر جائے۔“



دکاندار نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی اس بات سے اسے اس لڑکی کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا۔ مگر اس کی شکل و صورت اسے اپنا خیال بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کچھ ہچکچاتے ہوئے اس نے ایک سوٹ پیس اس کے سامنے رکھ دیا تھا اس نے کچھ کہے بغیر قیمت ادا کی اور کپڑا اٹھا کر باہر نکل آئی۔

میمونہ اور شیر انگن نے جیسے اس کے حال پر صبر کر لیا تھا۔ ان کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح معمولی باتوں پر روتی تھی نہ اس پر ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے۔ وہ صبح گھر سے نکلتی اور سہ پہر کو مقررہ وقت پر گھر آ جاتی۔ پھر خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھ کر قرآن پاک کا انگلش ترجمہ پڑھتی رہتی۔ ان کا خیال تھا آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوتی جائے گی اور پھر وہ مسلمان سے طلاق لے کر اسے باہر بھجوا دیں گے۔ انہوں نے اس کے منہ سے یہاں آنے کے بعد کبھی مسلمان کا ذکر نہیں سنا تھا۔ اس سے کوئی شکوہ اس کی کوئی شکایت اپنا کوئی پچھتاوا وہ انہیں کچھ بھی بتاتی تھی۔

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ رمضان کے پہلے جمعے کو وہ صلوٰۃ التَّسْبِيح پڑھنے شہر کے وسط میں واقع ایک جامع مسجد میں آئی تھی۔ وہ یگن سے اترنے کے بعد مسجد کی طرف آتے ہوئے اس نے فٹ پاتھ پر ایک درخت کے نیچے ایک بوڑھے آدمی کو کچھ روپے گنتے دیکھا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اس آدمی سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ وہ آدمی مختلف مالیت کے مڑے مڑے اور میلے کپیلے ٹوٹ اور سکے فٹ پاتھ پر گن گن کر رکھتا جا رہا تھا۔ ایک بار گنتے کے بعد اس نے دوبارہ روپے گنتے شروع کر دیے تھے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آ رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑی اسے بار بار روپے گنتے دیکھتی رہی۔ وہ یا تو بار بار گنتی بھول رہا تھا یا پھر اس کے روپے کم تھے۔ فلک بے اعتداری اس پاس آ گئی تھی۔

”کیا بات ہے بابا؟“ بوڑھے آدمی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا پھر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں روپے کہیں گر گئے ہیں میری کل کی دیہاڑی میں سے۔“

فلک نے چند لمحے اس بوڑھے آدمی کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا تھا اور پھر اپنی چادر کے پلو کو کھول کر اس میں بندھے ہوئے روپے نکال لیے تھے پچاس کا نوٹ تڑوا کر اس نے دس روپے وہ یگن والے کو کرائے کے طور پر دیئے تھے۔ باقی چالیس روپے اس نے پلو میں باندھ لئے تھے۔ اب وہ چالیس روپے اس نے جھک کر اس بوڑھے آدمی کے سامنے رکھ دیئے تھے۔

”یہ لیس بابا“ وہ دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے مسجد کی طرف بڑھ گئی تھی۔ آج وہ پہلی بار بالکل خالی ہاتھ تھے۔ لیکن اسے کوئی رنج نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی واپسی پر اسے چار میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا۔ وہ بھی روزے کی حالت میں۔ مگر وہ اس چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔

صلوٰۃ التَّسْبِيح کی نماز پڑھنے کے بعد وہ مسجد سے باہر نکل رہی تھی۔ جب اچانک بغیر کسی وجہ کے اس کا دل بھرا آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گھر جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ بیڑھیوں کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔ عورتیں مسجد کے اس مخصوص دروازے سے نکل کر جا رہی تھیں وہ گھنٹوں میں سر چھپائے وہیں بیٹھی رہی۔

”تجھے کیا ہوا ہے؟“ کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو اس کے سامنے بیڑھی پر کھڑی تھی۔

”پتا نہیں اماں۔“ اس نے کہا تھا۔

”کس کے ساتھ آئی ہے؟“ اس عورت نے ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھا تھا۔

”پتا نہیں۔“

”روتی کیوں ہے؟“ اس عورت کی نظر اب اس کے چہرے پر تھی۔

”یہ بھی پتا نہیں۔“

”کوئی بیماری لگ گئی ہے؟“ اس عورت کی آواز میں اب تشویش تھی۔

”پیارے نہیں اماں! روگ۔“

”ہائے ہائے! اس جوانی میں روگ لگ گیا۔“ اب اس کی آواز میں ہمدردی تھی۔

”یہ روگ جوانی میں ہی لگتے ہیں اماں۔“

”گھر کیوں نہیں جاتی؟“

”گھر ہو تو جاؤں۔“

”گھر چاہئے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر؟“ وہ عورت اب حیران تھی۔ وہ بھگی آنکھوں کے ساتھ اس عورت کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تمہیں کیا بتاؤں اماں کیا چاہئے؟“

”تو بتا تو سہی۔“ عورت نے اصرار کیا۔

”بتانے سے مل جائے گا کیا؟“

”سب کچھ بتانے سے ہی ملتا ہے۔ نہ بتانے سے کیسے ملے گا۔ مانگنا پڑتا ہے۔ کہنا پڑتا ہے۔ منت کرنی پڑتی ہے، وجود کے نصیب میں ہے

بھکاری ہونا بس ذات بھکاری نہیں ہو سکتی۔“

وہ سن ہو گئی تھی۔ ایک سرد لہر اس کی ریزھ کی ہڈی میں سے گزر گئی تھی۔ اس نے سراٹھا کر بوڑھی عورت کا چہرہ دیکھا تھا۔

”وجود کے مقدر میں مانگنا ہے۔“ ذات“ کا وصف دینا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے، کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا وہ خواہش کا نہ ہونا مانگتا ہے۔“

اس نے بے اختیار اس بوڑھی عورت کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت سے یوں جیسے وہ غائب ہو جائے گی۔

”تو بتا، تجھے کیا چاہئے؟“ پچھلے ایک سال سے جو فقرے رات دن اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ وہ انہیں سننے میں غلطی نہیں کر

سکتی تھی۔ پورے دو سال بعد اس نے ایک بار پھر وہی کلمات اس عورت کے منہ سے سنے تھے جو دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے اس فقیر نے کہے تھے۔



”ہاں تو بتا، تجھے کیا چاہئے؟“ عورت ایک بار پھر سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ اس کا پورا وجود کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

”مجھے گل چاہئے۔ مجھے ذات چاہئے۔ مجھے اللہ چاہئے۔ صرف اللہ چاہئے۔“

وہ کسی ننھے بچے کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر بلکنے لگی تھی۔

”اس سے کہو۔ مجھے دیکھے اس سے کہو۔ مجھ پر نظر کرے، ایک بار ایک لمحہ کے لیے، میں دیکھنے کے قابل نہیں ہوں پر اس سے کہو مجھے دیکھے اسے کہو میرے گندے وجود پر بھی ایک بار اپنی نظر کرے۔ اسے تو ٹھوکر مارنا نہیں آتا۔ اسے تو دھکا کرنا نہیں آتا۔ وہ تو فرق نہیں کرتا۔ وہ تو آس نہیں توڑتا۔ اس نے اب عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

”تجھے بنایا ہے اس نے تو کیا تجھے چھوڑ دے گا؟ کبھی ماں میلے میں بچے کی انگلی چھوڑتی ہے۔ اگر چھوٹ بھی جائے تو بچہ اتنا بے قرار نہیں ہوتا جتنی ماں ہوتی ہے۔ پھر اللہ انسان کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے ہمیشہ رہتا ہے۔“

اس نے اس عورت کے منہ سے ایک بار پھر وہی لفظ سنے تھے۔ اس نے سیرھی سے ٹیک لگالی۔ ایک عجیب سی خند کہ اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ بہت گہرا سکون اس کے اندر اترتا جا رہا تھا اس کے آنسو قہم گئے تھے۔

”گھر جا، اب اور کیا چاہئے تجھے؟“

اس عورت نے ایک بار پھر اس سے کہا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”چلی جاؤں گی اماں! اب واقعی اور کیا چاہئے۔“

بڑبڑاتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں، سامنے سیرھی پر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ عورت غائب ہو چکی تھی۔ وہ پرسکون انداز میں وہیں بیٹھی رہی اس نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔



وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس نے آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے وجود کو دیکھا تھا۔ ایک سال نے کتنی بہت سی تبدیلیاں کر دی تھیں۔ ہر چیز میں، باطن میں، ظاہر میں اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے دائیں ہاتھ سے چہرے کے ہر حصے کو چھوا تھا۔ آج کچھ بھی دلفریب نہیں لگ رہا تھا۔ آج پہلے کی طرح اپنا وجود آئینے میں دیکھ کر اس پر سحر نہیں ہو رہا تھا۔ اسے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ پورے ایک سال بعد وہ آج بیوٹی پارلر گئی تھی۔ مٹی کے ساتھ وہ بہت خوش تھیں اس کے نارمل ہو جانے پر مٹی نے اس کا فیصلہ کر دیا تھا، پلنگ، تھریڈنگ، پلنگ وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ اس نے پہلے کی طرح بیوٹیشن کے کام میں بار بار مداخلت نہیں کی تھی نہ ہی کوئی اعتراض کیا تھا۔

بیوٹی پارلر سے نکلنے ہوئے اس نے جسم کے گرد لپٹی ہوئی چادر کو ایک بار پھر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔ میمونہ کے ماتھے پر کچھ شکنیں ابھری تھیں۔  
 ”کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ انہوں نے خود کو دل ہی دل میں سمجھایا تھا۔  
 ”تم نے اپنی اسکن کا ستیاناس کر لیا ہے۔“

گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے فلک سے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ ابھری تھی۔  
 ”اللہ نے میرے دل کے داغ صاف کر دیئے ہیں، چہرے کی مجھے فکر نہیں ہے۔“  
 میمونہ خاموش رہی تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں۔ وہ دوبارہ پہلے جیسی باتیں کرنے لگے۔

اور اب وہ آئینے کے سامنے کھڑی دیکھ رہی تھی اسی وجود کو جس سے اسے عشق تھا، فخر تھا اور اب سب کچھ جیسے دھواں بن کر اڑ چکا تھا۔ عشق بھی فخر بھی وہ ایک گہری سانس لے کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔  
 ”فلک! فلک! سلمان آیا ہے۔“

ایک دم میمونہ اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ خوشی ان کے پورے پورے چھلک رہی تھی اس نے ایک لمحے کو نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا پھر نظر ہٹا لی۔

”جانتی ہوں مٹی! کہ وہ آ گیا ہے۔ جانتی تھی کہ وہ آ جائے گا۔“  
 ”وہ اس عورت کو طلاق دے آیا ہے۔ معافی مانگی ہے اس نے، کہتا ہے تمہیں لینے آیا ہے۔“ میمونہ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔

”برا کیا اس نے۔“ چند لمحے ماں کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس نے کہا تھا۔  
 ”ٹھیک کیا اس نے بالکل ٹھیک کیا۔ اس عورت کے ساتھ یہی ہونا چاہئے۔ تمہیں کیا پتا اس نے کس طرح دونوں ہاتھوں سے اس کا روپیہ لٹایا ہے۔ تم تو.....“  
 میمونہ اشتعال میں بول رہی تھیں اس نے ہاتھ اٹھا کر بڑی ملالت سے ان کی بات کاٹی تھی۔



”می! بس آپ چپ ہو جائیں۔ کچھ نہ کہیں نہ اس عورت کے بارے میں نہ روپے کے بارے میں نہ سلمان کے بارے میں۔“  
 ”وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میمونہ نے اس سے کہا تھا۔  
 ”بھجج دیں اسے۔“ وہ اب بھی اسی طرح پرسکون تھی۔ میمونہ مسکرا کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔

پورے ایک سال بعد دروازے سے وہ وجود اندر آیا تھا جسے دیکھ کر اس کی دھڑکن رک جایا کرتی تھی۔ جس کے چہرے سے وہ کوشش کے باوجود نظر نہیں ہٹا سکتی تھی۔ جس کی آواز اس کے ذہن میں نہیں دل میں گونجتی تھی۔ جس سے چند لمحوں سے زیادہ نظر میں ملائے رکھنا اس کے لیے بہت دشوار ہو جاتا تھا۔ آج..... آج ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ دل دھڑکنا بھولا تھا نہ اس سے نظر ملانی مشکل ہوئی تھی۔ وہ پرسکون انداز میں اسے کمرے میں آتا دیکھتی رہی۔ وہ شرمندہ تھا یہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

”السلام علیکم!“ گفتگو میں پہل اس نے کی تھی۔ وہ چونکا تھا۔ وہ ہمیشہ جیلو کہہ کر مخاطب ہوتی تھی اب چند لمحوں کے لیے وہ کچھ نہیں بول سکا پھر اس نے کچھ جھجکتے ہوئے وعلیکم السلام کہا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ کسی معمول کی طرح صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔

”کیسے ہو؟“ وہ اب حیران ہو رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟“ اس نے جواباً پوچھا تھا۔

”بہت اچھی ہوں۔“

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، سیاہ کٹن کے لباس میں لمبوس وہ سیاہ ہی رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ بہت دیر تک اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا تھا۔ اس کا چہرہ خلاف معمول میک اپ سے عاری تھا اور کوئی بہت ہی خاص کیفیت لئے ہوئے تھا۔

”میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ جانتا ہوں۔ میں یہ بات کہنے کا حق نہیں رکھتا، مگر پھر بھی تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اس سب کے لئے۔ جو میں نے کیا۔ میں نہیں جانتا، میں نے یہ سب کیسے کیا ہے؟ مگر میں۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا تھا۔

”تمہاری جدائی نے مجھے جس چیز سے نوازا ہے۔ اس کے آگے میرے لئے سلمان انصاری کسی کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ چھبیس سال کے بعد میں نے ایک سال اللہ کے ساتھ گزارا ہے اور اس پورے سال میں میرا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں۔ تمہاری طرف بھی نہیں۔ مجھے کوئی دکھ، کوئی افسوس نہیں ہے کہ ایک سال کے لئے تم نے مجھے جو کچھ دیا وہ چھبیس سال نہیں سے سکے۔ میں نے تو اس پورے سال تمہارے بارے میں سوچا ہی نہیں ہے۔ تم کس کے ساتھ تھے۔ کیوں تھے اس سب کا خیال نہیں آیا پھر تم کیوں شرمندہ ہو؟“

وہ بہت دیر تک کچھ بول نہیں سکا تھا۔ صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔

”میرے ساتھ چلو فلک! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“ فلک نے اسے دیکھا تھا۔

”کیا میرے لئے اس شخص کی اہمیت اس کمرے میں لٹکے ہوئے پردوں، کارپٹ، صوفہ، بیڈ، فرنیچر جیسی نہیں ہوگئی۔ چیزیں ہیں تو ہیں نہ ہوں تو

”نہ سہی اور میں..... میں کسی زمانے میں اس شخص سے اتنا عشق کرتی تھی کہ اس کے علاوہ مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور اب مجھے یہ شخص نظر نہیں آ رہا۔“  
اس نے سوچا تھا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

”میں چلوں گی لیکن تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں جس فلک سے تم نے چار سال پہلے شادی کی تھی۔ وہ مر چکی ہے۔ آج تم جسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ وہ کوئی اور ہے۔ اس فلک کے لئے سب کچھ تم تھے۔ میرے لئے سب کچھ اللہ ہے۔ اس فلک کے پاس صرف ظاہر تھا۔ میرے پاس صرف باطن ہے۔ وہ تمنا دیکھنا بھی پسند کرتی تھی، بنا بھی۔ مجھے یہ دونوں چیزیں پسند نہیں ہیں۔ وہ سوسائٹی میں زندگی گزارتی تھی۔ مجھے گھر کے اندر گزارنا ہے اسے نہ عیب چھپانا آتا تھا نہ جسم میں دونوں کو چھپانا چاہتی ہوں تم اگر ان سب باتوں کے باوجود مجھے ساتھ لے جانا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ واپس چلے جاؤ اپنی اور میری زندگی تباہ کرنے کی کوشش نہ کرو۔“

وہ بار بار یاری اپنے سارے مہرے آگے بڑھاتی گئی تھی۔

”مجھے تمہاری کسی بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔ صرف تم میرے ساتھ چلو۔“

اس نے سلمان کو کہتے سنا تھا اور وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سلمان نے ایک انگلش کیسٹ لگا دی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ فلک نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ ایک انسان سے محبت ہو جائے تو پھر اس کے بعد بندے کے دل میں کچھ اور نہیں آ سکتا اور اگر اللہ سے محبت ہو جائے تو پھر انسان کسی اور سے محبت کرنے کے قابل رہتا ہے؟ وہ بھی کسی انسان سے؟ وجود سے؟ ذات کی چاہ کے بعد وجود کی طلب ختم ہو جاتی ہے اور میرے ساتھ بیٹھا ہوا یہ شخص یہ بات کبھی نہیں جان سکتا کہ اب میرے لئے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہو گیا ہے۔

میں نے ذات کو چاہا تھا۔ ذات کے بعد وجود کا کوئی رنگ آنکھوں کو بھاتا ہے نہ دل کو قید کرتا ہے۔

اس شخص کو گمان ہے سب کچھ پھر پہلے کی طرح ہو جائے گا۔

اللہ کے آنے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے میں اس کے ساتھ زندگی جیتی تھی۔ اب زندگی بسر کروں گی اور یہ شخص ساری عمر اس خوش فہمی میں رہے گا کہ پہلے کی طرح اب بھی میرے لئے یہی سب سے اہم ہے۔ مگر اسے کیا پتا، میں نے دروازے کو رستہ روکنے نہیں دیا کم از کم ایک عورت کا تو۔“  
وہ گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

جدائی۔

بے بسی..... تنہائی۔

آنسو۔

کسی کی آس۔

خواہش



عشق لا حاصل

یہ سب کیا ہے؟

جنون کے راستے اور

بے نشان منزل۔

سلمان انصرا ب گانے کی ٹیون کے ساتھ ساتھ سیٹی بجا رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر سڑک کو دیکھتے ہوئے فلک کا چہرہ آنسوؤں سے بھگنے لگا تھا۔



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or**

**send message at  
0336-5557121**